بچوں کی دنیا
WWW.PAKSOCIETY.COM
قیمت
30 روپے
اکتوبر
2014

محمد نعیم شرقپوری پبلشر نے ملک نوید پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر "بچوں کی دنیا" شاہ عالم گیٹ، لاہور۔ ۲۷ سے شائع کیا!

حمد باری تعالیٰ

سب سے اعلیٰ نام ہے تیرا
رحمت کرنا کام ہے تیرا

سُورج ، چندا اور ستارے
تیرے نُور سے روشن سارے

رازق ہے تُو سارے جہاں کا
مالک ہے تُو کون و مکاں کا

پھول میں تیری ہی خوشبو ہے
ہر جا مولا تُو ہی تُو ہے

بخش دے میری جو بھی خطا ہے
میرے مولا تجھ سے دُعا ہے

شاعر: محمد رشید
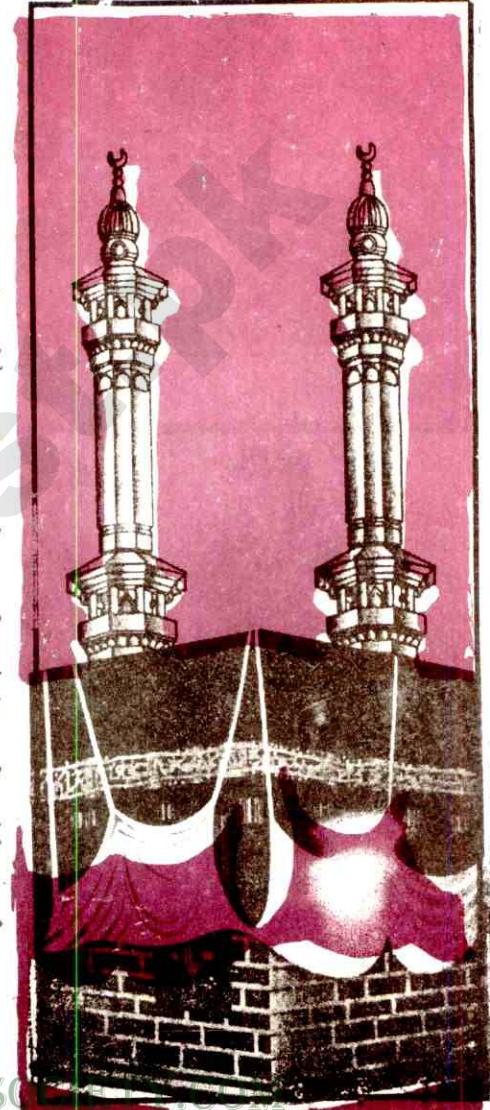
نعت رسول مقبولؐ

نبیوں میں ذی شان محمدؐ
کل خلقت کی جان محمدؐ

آپؐ کے روضے کی ہو زیارت
بس یہ ہے ارمان محمدؐ

آپؐ کی ساری خلقت ہے
سب سے اُونچی شان محمدؐ

اللہ عرشِ اولیٰ پر
حق کے ہوئے مہمان محمدؐ

سب جنوں اور انسانوں پر
آپؐ کا ہے احسان محمدؐ

آپؐ اگر فرمائیں نظر تو
مشکل ہو آسان محمدؐ

شاعر: عابد نظامی

سنیئے
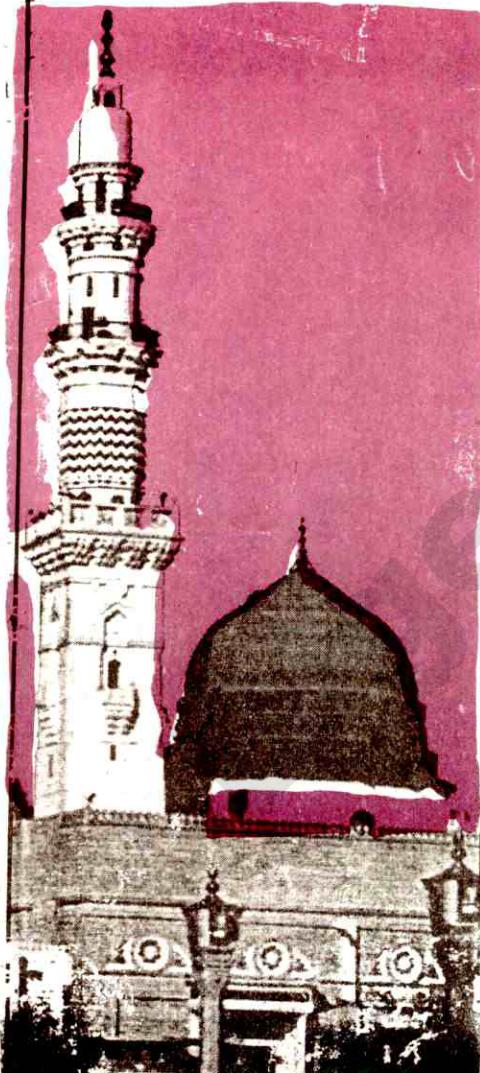
بچوں کی دنیا پڑھنے والے تمام پیارے بچوں کو السلام علیکم!

بچو! دن رات کی کوشش اور محنت کے بعد اکتوبر 2014 کا شمارہ آپ کے ہاتھ میں ہے امید ہے یہ شمارہ آپ کو بہت پسند آئے گا۔ بچو! جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ اس وقت ہمارا ملک بہت سے بحرانوں سے گزر رہا ہے جس میں سے سرفہرست سیلاب کی آفت ہے۔ جس میں آپ جیسے بہت سے ننھے بچے بھی مشکلات برداشت کر رہے ہیں۔ اللہ ان سب پر اپنا رحم کرے آپ سب بچوں سے گزارش ہے کہ آپ سب دوست مل کر اپنے والدین، بڑے بہن بھائیوں سے درخواست کریں کہ حسب توفیق سارے ہی سیلاب زدگان کی مدد کریں اور مشکل کی اس گھڑی میں ان کو اکیلا نہ چھوڑیں ایسا کرنے سے ایک تو ان مصیبت زدہ لوگوں کی مدد ہو جائے گی دوسرا اللہ کی رضا حاصل ہوگی۔ آخر میں اللہ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب پر اپنا رحم کرے اور ہمارے گناہ بخش دے۔

والسلام

آپ کا بھائی جان

اس کا مطلب ہے کہ یہ لوگ یہ ٹافیاں وغیرہ خود تیار کرواتے ہیں ننھے نے کہا ظاہر ہے سکول کے معصوم بچے جب یہ ٹافیاں کھائیں گے جو اصل میں نشہ ہے تو وہ اس چیز کے عادی ہو جائیں گے اور اتنی سی عمر میں وہ نشہ لینے لگیں گے۔ یہ سب دیکھ کر ننھا بڑا پریشان ہوا وہ ابھی تک ان لوگوں کے عزائم نہیں جان پایا تھا "وہ لوگ یہ سب کام میرے علم میں لائے بغیر بھی کر سکتے تھے وہ لوگ میرے علم میں لائے بغیر یہ چیزیں بیچنے کے لیے دے کر جا سکتے تھے" ارشد نے کہا۔

کہیں وہ تمہارے علم میں اس لیے یہ

بات تو نہیں لائے ہیں کہ تم انھیں بیچنے میں احتیاط سے کام لو" ننھے نے جواب دیا۔

"میں یہ ٹافیاں نہیں بیچ سکتا میں معصوم بچوں کو اس زہر کا شکار ہوتے نہیں دیکھ سکتا میں یہ نہیں کر سکتا" ارشد نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔ ننھے نے دو ٹافیاں لے کر جیب میں ڈالیں اور ارشد کو کچھ ہدایات دے کر اس کے گھر سے نکل آیا وہ ٹافیاں لے کر سیدھا
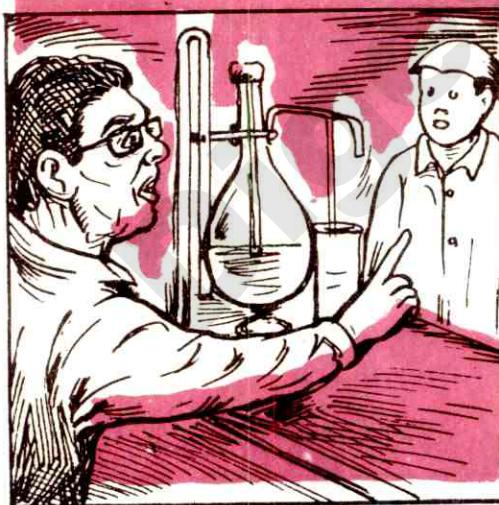
ایک لیبارٹری میں گیا جہاں کا انچارج ننھے کا دوست تھا ننھے نے وہ ٹافیاں اسے دیں اور ان کا ٹیسٹ کرنے کو کہا۔ انچارج نے ننھے سے وہ ٹافیاں لے لیں اور اسے دو گھنٹے کے بعد آنے کا کہا۔ ننھا ادھر اُدھر گھومنے لگا وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ ٹافیوں میں کس قسم کا نشہ ہے۔ دو گھنٹے کے بعد جب اسے ان ٹافیوں کی رپورٹ ملی تو وہ یہ دیکھ کر

حیران رہ گیا کہ ٹافیوں میں موجود نشہ نہ صرف بچوں کو اس شے کا عادی بنا دیتا بلکہ ان کے دماغ کو بھی بے حد متاثر کرسکتا تھا۔ نھا یہ سب جان کر بہت پریشان ہوا وہ اگر چاہتا تو ان لوگوں کو گرفتار بھی کروا سکتا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ ان کا یہ کھیل کس حد تک پھیلا ہوا ہے اور ان کا حلقہ کتنا وسیع ہے۔ وہ ایک یا دو افراد کو گرفتار کروا کے ارشد اور اس کے گھر والوں کے لیے مصیبت کھڑی نہیں کرتا چاہتا تھا اس نے ارشد سے اِس بارے میں کوئی بات نہ کی اور رپورٹ لے کر گھر آ گیا اور کھانا کھا کر سونے کی تیاری کرنے لگا وہ چاہتا تھا کہ صبح تازہ دم ہو کر اس سارے معاملے پر غور کرے ارشد کی طرف سے وہ مطمئن تھا کہ جس طرح وہ ارشد کو ہدایات دے کر آیا ہے وہ یقیناً ویسا ہی کرے گا اور پھر تھوڑی ہی دیر میں

ننھا خواب خرگوش کے مزے لینے لگا۔

اگلی صبح ارشد اٹھا اور نماز پڑھ کر اس نے رب سے سچے دل سے مدد کی فریاد کی اور پھر دکان کی طرف چل پڑا وہ صبح ہی صبح دکان کھولتا تھا کیونکہ سکول کے بچے پنسل کاپیاں وغیرہ اس کی دکان سے خریدتے تھے ارشد نے ننھے کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے وہ کاؤنٹر سے نیچے چھپا کر رکھی تھیں ارشد کی دکان ایسی تھی کہ شیشے کے پار دور سے آتا ہوا انسان بھی نظر آ جاتا تھا ننھے نے اسے یہ ہی ہدایت کی تھی کہ جب ان لوگوں میں سے کوئی آتا نظر آئے تو فوراً ٹافیوں کے پیکٹ اوپر رکھ دے ارشد کو یقین تھا کہ صبح ہی صبح ان میں سے کوئی بھی دکان پر نہیں آئے گا لیکن اچانک اسے سامنے سے ان میں سے ایک شخص آتا نظر آیا۔
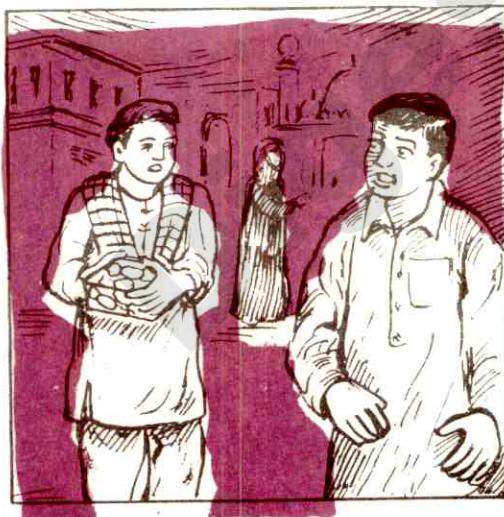
(پھر کیا ہوا اگلے شمارے میں پڑھیں)

قبر پھاڑ مردہ

نورالکنیہ قاضی

پیارے بچو! صدیاں گزریں بلند و بالا سر بفلک چوٹیوں والے پُرشکوہ پہاڑوں کے دامنوں میں واقع ہرے بھرے سرسبز و شاداب میدانوں میں ایک نہایت خوبصورت چھوٹا سا گاؤں آباد تھا۔ اِس گاؤں کا ... آباد تھا۔ اِس گاؤں کے لوگ بے حد خوشحال اور فارغ البال تھے۔ اُن کے کھیت سونا اُگلتے تھے۔ اُن کے

مال مویشیوں کی بھی بڑی کثرت تھی۔ وہ بڑے عیش و آرام کی زندگی گزار رہے تھے۔

شاہ آباد کے لوگ شروع شروع میں بڑے پکے مسلمان ہوا کرتے تھے۔ وہ نماز پڑھتے، روزے رکھتے اور زکوٰۃ دیتے تھے۔ حج کو جاتے تھے۔ نیکی کے کام کرتے تھے۔ غریبوں اور محتاجوں کی دست گیری کرتے

تھے۔ ان کے ہاں اسلامی تہوار بھی بڑے جوش وخروش سے منائے جاتے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ خوشحالی اور فارغ البالی کی زندگی نے اُنہیں رفتہ رفتہ اللہ کی یاد سے غافل

کرنا شروع کردیا۔ وہ نماز پڑھنے میں تسا[illegible] لگے۔ گاؤں کی مسجد جو پہلے نمازیوں سے بھری رہتی [illegible] اب رفتہ رفتہ خالی ہونے لگی۔ مسجد کے مولوی صاحب [illegible]

بڑے نیک اور خدا ترس آدمی تھے، بہترا لوگوں کو سمجھاتے۔ اُنہیں نماز کیلئے بلاتے۔ اللہ کا خوف دلاتے مگر گاؤں کے لوگوں پر کم ہی اثر ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ دو چار آدمی نماز کے وقت مسجد میں آجاتے اور بس نماز سے غفلت اور پہلوتہی نے لوگوں کو دیگر شعائر اسلامی سے بھی منہ موڑنے پر اُکسایا۔ اُنہوں نے روزے رکھنے بھی اپنے آپ پر گراں سمجھنے شروع کر دیئے۔ زکوٰۃ دینا بھی اُنہیں ظلم محسوس ہونے لگا تو حج پر جانا بھی چھوڑ دیا۔ یتیموں، بیواؤں اور ضرورت مندوں کی مدد کرنا اُنہیں مشاق گزرنے لگا۔ صدقہ خیرات سے اُن کی جان نکلنے لگی۔ غرضیکہ وہ صرف نام ہی کے مسلمان رہ گئے۔ اُن کا کام اب زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنا اور اُسے اپنے عیش و آرام پر خرچ کرنا رہ گیا۔ مذہب سے دوری نے اُن کے ذہنوں سے اسلامی تعلیمات بھی بھلا دیں۔ بالکل کافروں اور مشرکین جیسی حرکتیں کرنے لگے۔ پاکیزہ طور و طریق کو چھوڑ کر وہ بُری اور قبیح عادتوں اور حرکتوں میں مبتلا ہو گئے۔ اُن کے ہاں اب اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا کوئی خیال باقی نہ رہا۔ آخرت کی پوچھ گچھ اور سزا و جزا کی اُنہیں کوئی فکر نہ رہی۔ وہ پوری طرح شیطان کے چنگل میں پھنس کر لہو و لعب کے عادی ہو گئے۔ اُن کے ہاں عام شراب پی جانے لگی، جوا کھیلا جانے لگا۔ چوریاں ڈاکے، جھوٹ، بدکاری اور بے حیائی کے کام اُن میں عام ہو گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سب برائیاں اُن کی فطرت ثانیہ بنتی گئیں۔ گاؤں کی مسجد پر تالا پڑ گیا۔ قرآن مجید کے قلمی نسخے لوگوں کے گھروں سے غائب ہو گئے۔ دینی کتابیں پڑھنے والا کوئی نہ رہا حتیٰ کہ اُن کا بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گاؤں سے نام و نشان مٹ گیا۔ اب نہ تو وہاں کوئی اسلامی تعلیم دینے والا باقی رہا نہ اِس تعلیم پر عمل کرنے والا۔ اِس گاؤں کے لوگ بالکل زمانہ قبل از اسلام کے عربوں جیسے ہو گئے جن میں ہر اخلاقی و معاشرتی برائی موجود تھی۔

اِس گاؤں کے باہر پہاڑ کے دامن میں ایک بیحد پرانا قبرستان تھا۔ گاؤں کے لوگ اِس قبرستان میں اپنے مردے نہ دفناتے تھے بلکہ اُنہوں نے اپنے مردوں کیلئے ایک الگ قبرستان بنایا ہوا تھا۔ وہ پرانا قبرستان صدیوں پرانا تھا۔ شاہ آباد کے بسنے سے پہلے بھی وہ قبرستان وہاں موجود تھا۔ اُس کی قبریں بے حد پرانی اور بے حد خستہ حالت میں تھیں۔ اکثر قبریں بیٹھ چکی تھیں اور اُن میں مُردوں کی ہڈیاں پڑی دکھائی دیتی تھیں۔ اکثر قبروں کے ڈھانچے بالکل صحیح حالت میں بھی تھے۔ گاؤں کے لوگ

عام طور پر اِن قبروں کی مرمت وتعمیر کی طرف کوئی توجہ نہ دیتے تھے بلکہ وہ اِس قبرستان کی طرف سے گزرتے نہ تھے۔

پھر ایک دن کرنا خدا کا ہوا کہ گاؤں کا چوہدری اپنے کچھ یار دوستوں کے ساتھ چوپال میں بیٹھا ناؤ نوش اور فضول گپ بازیوں میں مصروف تھا کہ ایک بے حد بڑی سی خوفناک چمگارڈ جس کی آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں، اپنے بڑے بڑے پر پھیلائے لمبے لمبے سفید دانت نکالے بڑی دل ہلا دینے والی چیخیں مارتی ہوئی اُن کے سروں کے اُوپر سے گزرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔ اُس کا رخ اِس طرف تھا جہاں پرانا قبرستان واقع تھا۔

چوپال میں موجود ہر شخص اُسے دیکھ کر اور اُس کی خوفناک چیخیں سن کر بے حد خوف زدہ اور سہا ہوا سا دکھائی دے رہا تھا۔ کسی نے بھی اپنی عمر میں اپنی بڑی جسامت کی اور ایسی خوفناک چمگارڈ نہ دیکھی تھی۔

"یہ چمگارڈ نہیں کوئی شر شرار ہے' چوہدری صاحب مجھے تو لگتا ہے کہ ہمارے گاؤں پر کوئی آفت ٹوٹنے والی ہے"......

ایک آدمی بولا۔

"میں نے اپنی عمر میں کبھی اتنی بڑی اور خوفناک چمگارڈ نہیں دیکھی۔ یہ ضرور کوئی بلا ہے جو ہمیں ستانے ہمارے گاؤں میں گھس آئی ہے"......

ایک دوسرا آدمی بولا۔

"وہ پرانے قبرستان کی طرف اُڑ گئی ہے۔ ضرور یہ کسی بُرے آدمی کی بدروح ہوگی"

ایک اور آدمی نے خیال ظاہر کیا۔

"اب یہ بدروح ہمیں ستانا شروع کردے گی۔ ہمیں اِس سے نجات حاصل کرنے کیلئے کچھ کرنا چاہیے"

چوہدری فکرمندی سے بولا۔

"کیوں نہ چل کر دیکھا جائے کہ وہ چمگارڈ اِس پرانے قبرستان میں کیا کرنے گئی ہے؟ اگر وہ کسی قبر میں گھس گئی ہے تو ہم مٹی کا تیل چھڑک کر اُسے آگ لگا سکتے ہیں"...... پہلا آدمی بولا۔

چنانچہ اُنہوں نے مٹی کے تیل کا ایک ڈبہ، لاٹھیاں اور دوسرے ہتھیار وغیرہ لئے اور پرانے قبرستان کی سمت ہو لئے۔ راستے میں اور لوگ بھی آ کر آ کر اُن میں شامل ہوتے گئے۔ اُنہوں نے بھی اِس خوفناک چمگارڈ کو چیختے چلاتے پرانے قبرستان میں جاتے دیکھا تھا۔ وہ بھی اُس

کے بارے میں تجسس میں مبتلا تھے۔

پرانا قبرستان اُس وقت بالکل ویران پڑا ہوا تھا۔ وہ سب لوگ اُس کے باہر پہنچ کر رک گئے۔ اتنی ہمت اور دلیری دکھانے کے باوجود ہر شخص اندر ہی اندر سے مارے خوف کے کپکپا رہا تھا۔ وہ خوفناک چمگادڑ وہاں کہیں بھی نہ دکھائی دے رہی تھی۔ پھر ایک دم ہی ایک ٹوٹی ہوئی قبر کے قرب سے یوں آوازیں آنے لگیں جیسے اُس کے اندر کوئی بڑا سا پرندہ پھڑ پھڑا رہا ہو۔

"وہ چمگادڑ ضرور اِس قبر میں گھس گئی ہے۔ چلو چل کر اُسے ہلاک کریں"

چوہدری بولا۔

اُس کے ساتھی کچھ ڈرتے کانپتے لاٹھیاں اور کلہاڑیاں لے کر اُس قبر کی طرف بڑھ گئے۔ وہ قبر بے حد پرانی اور خستہ حال تھی۔ اُس کے سرہانے اینٹیں بھی کبھی کی اکھڑ چکی تھیں۔ ڈرتے ڈرتے بظاہر بہادر بنتے جب وہ لوگ اِس کے قریب پہنچے تو اُس کے اندر سے پرندے کے پھڑ پھڑانے جیسی آوازیں ایک دم ہی بند ہو گئیں۔ اُنہوں نے قبر کے سرہانے پہنچ کر اُس کے اندر جھانکا۔ دوسرے ہی لمحے وہ سب چیخیں مارتے ہوئے بے تحاشہ سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

اِس قبر میں کوئی چمگادڑ نہیں تھی بلکہ ایک کفن پوش مردہ لیٹا ہوا تھا جس کا جبڑا بڑے بھیانک انداز میں کھلا پڑا تھا۔ اُس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے اُبلی پڑ رہی تھیں اور انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

چوہدری اور اُس کے ساتھی ہانپتے کانپتے پسینے میں شرابور تھے۔ دہشت سے اُن کے منہ سے آواز تک نہ نکل رہی تھی۔ بالآخر چوہدری بولا:

"لگتا ہے کہ وہ خوفناک چمگادڑ اِس بھیانک مردے کا روپ دھار گئی ہے۔ میں نے اپنی عمر میں کبھی ایسا ہوتے نہیں دیکھا۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہمارے گاؤں پر ضرور کوئی آفت ٹوٹنے والی ہے"

"وہ مردہ ضرور کوئی خون آشام بلا ہو گی چوہدری صاحب! سنا ہے کہ ایسے مردے چمگادڑوں کا روپ دھار کر رات کو لوگوں کا خون پیتے پھرتے ہیں"

ایک آدمی خوف سے کپکپائی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہمیں اِس بلا سے چھٹکارا پانے کیلئے کچھ کرنا چاہیے ورنہ ہماری خیر نہیں"...... ایک دوسرا آدمی بولا:

"کس طرح؟ تم اِس بلا کو ایک نظر دیکھتے ہی وہاں سے بزدلوں کی طرح بھاگ آئے ہو"

چوہدری طعن آمیز لہجے میں بولا۔

"اِس مرتبہ ہم نہیں بھاگیں گے۔ ہم ابھی اور اِسی وقت اُس قبر پر جا کر اِس بلا کا خاتمہ کئے دیتے ہیں"

ایک سورما اپنی کلہاڑی لہراتے ہوئے بولا۔

لیکن وہ لوگ جب قبرستان پہنچ کر اپنے ہتھیار سنبھالے اُس قبر پر پہنچے تو اُس کے اندر جھانکنے پر اُنہیں سوائے چند ٹوٹی پھوٹی ہڈیوں کے اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ حیران و پریشان سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

"حیرت ہے وہ بھیانک مردہ کہاں غائب ہوگیا؟"

"اور وہ خوفناک چمگادڑ؟ وہ بھی کہیں نظر نہیں آرہی"......

"ہم نے تو اپنی آنکھوں سے اُس خوفناک مردے کو دیکھا تھا۔ یہ ہمارا وہم تو نہیں ہوسکتا"

"وہ چمگادڑ ضرور کوئی شر شرار ہوگی۔ اُس نے اِس قبر میں گھس کر ایک خوفناک مردے کا روپ دھارا۔ ہمیں ڈرایا اور اب غائب ہوگئی ہے"

وہ سب قبر کے قریب کھڑے دیر تک مختلف قیاس آرائیاں کرتے رہے۔ پھر وہاں سے چلے آئے۔ اُن سب کا خیال تھا کہ وہ چمگادڑ یا شر شرار جو کچھ بھی تھی، اب اُن کے گاؤں سے دفعان ہو چکی تھی۔ اب ہمیں پریشان ہونے اور فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اُس رات جب آسمان پر چاند اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ روشن تھا اور سارا گاؤں خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا تو اُس پرانے قبرستان میں واقع وہ پرانی ٹوٹی پھوٹی قبر پھٹی اور اُس میں سے وہ کفن پوش مردہ باہر نکل آیا۔ اُس کی لمبائی ایک عام آدمی کے قد جتنی تھی۔ اُس کے کفن پر جابجا خون لگا تھا۔ اُس کی اپنے حلقوں سے اُبلی ہوئی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ اُس کا جبڑا بڑے بھیانک انداز میں کھلا ہوا تھا۔ اُس کے دانت بے حد سفید اور لمبے لمبے تھے۔

قبر سے باہر آنے کے بعد وہ مردہ گاؤں کی سمت ہولیا۔ اُس کے راستے میں جو پہلا گھر پڑا وہ فضلو کسان کا تھا۔ مردے نے اُس کے دروازے پر دستک دی۔ یہ دستک کچھ ایسی تھی کہ اپنے گھر کے صحن میں سویا ہوا فضلو ایک دم جاگ گیا۔

"نجانے رات کے اِس پہر کونسا مہمان آگیا ہے"

اُس نے سوچا اور چارپائی پر سے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ دوسرے ہی لمحے اُس کے حلق سے ڈری ڈری سی چیخ نکل گئی۔ اُس کے سامنے ایک کفن پوش مردہ بڑے بھیانک انداز میں جبڑا کھولے کھڑا تھا۔ فضلو کے دیکھتے

ہی دیکھتے اُس مردے کے کھلے ہوئے منہ سے بے شمار چمگاڈریں نکلیں اور فضلو کو چمٹ گئیں۔ فضلو کو یوں محسوس ہوا جیسے سینکڑوں سوئیاں اُس کے جسم میں کھب گئی ہوں۔ اُس نے مارے درد و تکلیف کے چیخنا چلانا اور اِدھر اُدھر بھاگنا دوڑنا شروع کر دیا لیکن چمگاڈریں بدستور اُس سے چمٹی رہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں اُس کا جسم ڈھیلا ڈھالا ہو کر زمین پر گر گیا۔ وہ مر چکا تھا۔ چمگاڈروں نے اُس کے جسم کا آخری قطرہ خون تک چوس ڈالا تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد وہ چمگاڈریں مردے کے کھلے ہوئے منہ میں واپس چلی گئیں اور مردہ قبرستان واپس ہولیا۔ وہاں پہنچ کر وہ اپنی قبر میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں اُس قبر میں چند ٹوٹی بکھری ہوئی ہڈیاں ہی باقی رہ گئیں۔

اگلی صبح جب گاؤں کے لوگوں نے فضلو کسان کو اپنے گھر میں مرے ہوئے پایا تو اُنہوں نے دیکھا کہ اُس کا تمام جسم بالکل پیلا زرد پڑا ہوا تھا اور اُس پر ہر جگہ سرخ سرخ باریک نشانات تھے۔ اُنہوں نے یہ سمجھا کہ شاید اُسے رات سوتے میں کچھ زہریلے کیڑے مکوڑے کاٹ گئے تھے جن کے تیز زہر کے اثر سے اُس کی موت واقع ہو گئی تھی۔ اُنہوں نے اُس کی اِس موت پر دکھ محسوس کرتے ہوئے اُس کی تجہیز و تکفین کر دی۔

اگلی رات جب سارا گاؤں گہری نیند کے نشے میں غرق تھا، وہ کفن پوش مردہ پھر اپنی قبر پھاڑ کر باہر نکلا اور نئے شکار کی تلاش میں گاؤں کی سمت ہولیا۔ اِس مرتبہ شکار کیلئے اُس نے جو گھر چنا وہ ایک بیوہ عورت حورن کا تھا۔ حورن کی کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اپنے گھر میں تنہا ہی رہتی تھی۔ مردے نے اُس کے گھر کے باہر پہنچ کر دروازے پر دستک دی۔ حورن جو ابھی کچی نیند میں تھی، فوراً ہی اُٹھ بیٹھی۔ جانے رات کے اِس پہر کون اُس کے گھر آ گیا تھا؟ اُس نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ دوسرے ہی لمحے وہ چیخ مار کر بے ہوش ہو کر زمین پر گر گئی۔ اُس کے سامنے ایک بے حد بھیانک کفن پوش مردہ کھڑا تھا جس کا جبڑا بڑے بھیانک انداز میں کھلا ہوا تھا۔ اُس کی اُبلی ہوئی آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ پھر اُس مردے کے کھلے ہوئے منہ سے بے شمار چمگاڈریں نکلیں اور بے ہوش حورن کو چمٹ گئیں۔ اُنہوں نے غریب عورت کے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی چوس لیا اور مردے کے کھلے ہوئے منہ میں واپس چلی گئی۔ اِس کے بعد وہ مردہ بھی قبرستان میں واپس ہولیا اور وہاں پہنچ کر اپنی قبر میں غائب ہو گیا۔

اگلے دن جب گاؤں والوں نے حورن کو اُس کے

گھر میں مرے ہوئے پایا تو اُنہوں نے دیکھا کہ اُس کا تمام جسم بے حد پیلا زرد پڑا ہوا تھا اور اُس پر بھی فضلو کسان کی طرح چھوٹے چھوٹے سرخ نشانات موجود تھے۔ اِس پر اُنہیں خاصی حیرت ہوئی۔ اُنہوں نے اِس پر قیاس آرائیاں شروع کر دیں۔ آخر اِن دونوں میں ایک ہی جیسی دو اموات کیسے واقع ہو گئیں تھیں؟ اِن میں ایسی مشابہت کیوں تھی؟ یہ بھلا ممکن ہو سکتا تھا کہ فضلو کی موت اگر زہریلے کیڑے مکوڑوں کے کاٹنے سے واقع ہوئی ہو؟ یہ بات تو ہرگز ماننے والی معلوم نہ ہوتی تھی بلکہ یہ ایک خاصا پُراسرار معاملہ نظر آتا تھا۔ اُس دن گاؤں بھر میں فضلو اور حورن کی موتیں سب لوگوں کی گفتگو کا موضوع بنی رہیں۔ فضلو کے بعد اب حورن کی اُس سے ملتی جلتی موت نے سب کے دلوں میں کچھ خوف سا پیدا کر دیا تھا۔ وہ اندر ہی اندر بے حد ڈرے سہمے ہوئے تھے۔

اگلی رات جب سب گاؤں والے سو گئے اور اُس کی گلیوں کوچوں میں سناٹا چھا گیا تو وہ کفن پوش مردہ اپنی قبر پھاڑ کر باہر نکلا اور گاؤں کی سمت ہو لیا۔ اِس مرتبہ اُس کا رخ گاؤں کے حکیم کے گھر کی سمت تھا۔ حکیم کا گھر گاؤں کی عام آبادی سے قدرے ہٹ کر ایک الگ تھلگ سی جگہ پر کھیتوں کے قریب واقع تھا۔ وہ مردہ اُس کے مکان کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ اُس مکان کے سامنے واقع کھیتوں میں بالکل خاموشی تھی۔ صرف قریبی ندی میں پانی کے بہنے کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اِس وقت گاؤں کا ایک کسان کریمو اپنے کھیتوں کو پانی دینے کیلئے وہاں بیٹھا تھا۔ اُس نے چاند کی روشنی میں حکیم کے گھر کسی سفید پوش کو کھڑے دیکھا تو وہ چونک گیا۔ وہ فطری طور پر ایک بے حد بہادر آدمی تھا۔ اُس نے سوچا کہ شاید وہ کوئی چور یا ڈاکو تھا جو حکیم کے گھر گھسنا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنی کلہاڑی ہاتھ میں لے لی اور دبے پاؤں حکیم کے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ سفید پوش اُس سے کافی فاصلے پر تھا۔ وہ درختوں کے سایوں میں ہوتا، لمبی لمبی گھاس میں چھپتا چھپاتا، پھونک پھونک کر قدم اُٹھاتا اُس کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اُس سفید پوش نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ اِس طرح اُس کا سامنے کا پورا رخ کریمو کے سامنے آ گیا۔ کریمو فرطِ خوف سے اپنی جگہ پر ساکت و جامد کھڑا رہ گیا۔ وہ سفید پوش دراصل کوئی کفن پوش مردہ تھا۔ اُس کے کفن پر جگہ جگہ خون لگا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ اور اپنے حلقوں میں سے اُبل پڑ رہی تھیں۔ اُس کا جبڑا بڑے بھیانک انداز میں کھلا ہوا تھا۔ کریمو کے دیکھتے ہی دیکھتے اُس مردے نے حکیم کے

دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور حکیم باہر نکل آیا۔ اِس خوفناک مردے پر نظریں پڑتے ہی اُس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر گیا۔ اُس کے زمین پر گرتے ہی مردے کے کھلے ہوئے منہ سے بے شمار چمگادڑیں نکل کر حکیم کو چمٹ گئیں۔ اُنہوں نے اُس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک چوس لیا اور مردے کے منہ میں واپس چلی گئیں۔ اِس کے بعد مردہ وہاں سے چل پڑا۔

کریمو اتنے عرصے میں اپنے خوف و دہشت کو دبائے اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا تھا۔ اُس نے جو مردے کو جاتے دیکھا تو اُس نے سوچا کہ اُسے اِس کا تعاقب کرنا چاہیے اور پتہ چلانا چاہیے کہ آخر وہ کہاں سے آتا ہے اور کہاں جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی کلہاڑی وہیں رکھ کر بڑی احتیاط سے پھونک پھونک کر قدم اُٹھاتے ہوئے مردے کے تعاقب میں ہولیا۔

مردے نے گاؤں کی گلیاں طے کیں اور پرانے قبرستان کی سمت ہولیا۔ کریمو کافی فاصلہ رکھتے ہوئے اُس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ اِس قبرستان میں پہنچ کر وہ مردہ ایک پرانی سی ٹوٹی پھوٹی سی قبر میں جا کر غائب ہوگیا۔ وہ کچھ دیر کھڑا اِس قبر کو دیکھتا رہا۔ پھر واپس ہولیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ضرور کسی بدروح نے اِس ... اپنا مسکن بنالیا تھا اور اب وہ یوں بے گناہ لوگوں کو ہلاک کرتی جا رہی تھی۔ اگر اِس سے جلدی چھٹکارا نہ پایا جاسکا تو بعید نہیں کہ وہ گاؤں کی ساری آبادی کو ختم کر ڈالے۔ وہ گاؤں کے لوگوں کی نسبت کچھ تعلیم یافتہ اور مذہب سے لگاؤ رکھنے والا آدمی واقع ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بھوت پریت، شرشرار اور بدروحیں مادی ہتھیاروں سے نہیں بھگائے جاسکتے۔ اِن سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے روحانی ہتھیاروں کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور یہ بات انتہائی افسوس ناک تھی کہ اِس گاؤں میں کوئی بھی ایسا شخص موجود نہ تھا جو دینی علوم میں ایسی دسترس رکھتا۔ سب ہی لوگ مذہب سے بالکل بیگانہ اور اللہ و رسول ﷺ کو بھولے ہوئے تھے۔ اُنہیں قرآن حکیم تو کیا کلمہ طیبہ بھی نہیں آتا تھا۔ اللہ کے نام سے تو سب کی زبانیں نا آشنا ہو چکی تھیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو گاؤں کے لوگ مذہب پرست اور پکے مسلمان ہوتے۔ شعائر اسلامی کے پابند ہوتے تو کوئی بڑی روح، شرشرار یوں وہاں آ کر نہ ڈیرہ ڈال بیٹھتا نہ یوں بندگان خدا کو ہلاک کرتا پھرتا۔

کریمو کافی دیر تک اپنے گھر بیٹھا اِس بلا، اِس کفن ...

پوش، خون آشام چمگادڑوں والے مردے سے نجات پانے کی تدبیریں سوچتا رہا۔ پھر جب صبح ہوئی تو اُس نے اپنا گھوڑا کھولا اور اُس پر بیٹھ کر قریبی گاؤں روانہ ہو گیا۔

وہ جب اِس گاؤں میں پہنچا تو اُس وقت وہاں کے لوگ نمازِ فجر سے فارغ ہو کر مسجد سے نکل رہے تھے۔ مسجد کے مولوی صاحب ابھی مسجد ہی میں موجود تھے، کریمو اندر چلا گیا اور مولوی صاحب سے ملا۔ اُس نے اُنہیں بتایا کہ وہ اُن کے پاس ایک انتہائی ضروری کام سے آیا تھا۔ اُسے اُن کی مدد کی اشد ضرورت تھی۔ مولوی صاحب اُسے اپنے ساتھ اپنے حجرے میں لے گئے۔ وہاں اُنہوں نے کریمو سے اِس اہم کام کے بارے میں دریافت کیا۔ کریمو نے اُنہیں اِس کفن پوش مردے اور اُس کے ہاتھوں ہلاک ہونے والی ہلاکتوں کی تمام کہانی کہہ سنائی۔ مولوی صاحب نے یہ سب باتیں سن کر افسوس سے سر ہلایا اور بولے:

"بیٹا کریمو! یہ سب اللہ اور رسول ﷺ اور مذہب سے مکمل بیگانگی اختیار کر لینے کا نتیجہ ہے جو اِس شر شرار نے تمہارے گاؤں کو اپنی شکار گاہ بنا لیا ہے۔ ایسا نہ ہوتا اگر تمہارے گاؤں والے سچے مسلمان اور اسلامی تعلیمات پر کاربند ہوتے۔ مسجد کو آباد رکھتے تو کبھی کوئی بھوت پریت یا بدروح آ کر نہ بستی نہ اُنہیں کوئی نقصان پہنچ سکتا۔ اِن حالات میں میرا فرض ہے کہ تمہارے گاؤں کے لوگوں کو بھولے ہوئے فرائض یاد دلاؤں۔ اِنہی اسلامی تعلیمات پر کاربند رہنے کی تلقین کروں لیکن آج ہی تمہارے ساتھ تمہارے گاؤں چلتا ہوں۔ اِس شر شرار یا بدروح کو وہاں سے نکالنے کیلئے میں جو کچھ کر سکا کر دوں گا"......

اِس کے بعد مولوی صاحب نے کریمو کو ناشتہ کروایا اور اُس کے ہمراہ گھوڑے پر بیٹھ کر اُس کے گاؤں روانہ ہو گئے۔ گاؤں میں اُس وقت سب لوگ چوپال میں جمع تھے۔ وہ حکیم کی پراسرار موت پر طرح طرح کے تبصرے کر رہے تھے۔ حکیم کی موت بھی فضلو کسان اور حورن کی موت سے ملتی جلتی تھی اور اِس امر نے اِن میں بہت خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا۔ کریمو چوپال میں پہنچ کر گھوڑے سے اُتر گیا۔

چوہدری نے مولوی صاحب کو بھی نیچے اُتارا۔ وہاں موجود سب لوگ اُن کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ چوہدری صاحب نے مولوی صاحب کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور اُن سے وہاں آنے کی غرض و غایت دریافت کی۔ اِس پر مولوی صاحب نے وہاں موجود سب

لوگوں کو کریمو کے اپنے پاس آنے اور اُس کی زبانی سنی ہوئی باتوں کے بارے میں بتایا اور کہا کہ وہ اُنہیں اِس بدروح یا شرشرار سے نجات دلانے کیلئے وہاں پہنچے تھے کیونکہ اُنہیں صرف روحانی ہتھیاروں سے ہی بھگایا جاسکتا تھا۔ پھر کریمو نے اُنہیں بتایا کہ کس طرح اُس نے رات کھیتوں کو پانی دیتے ہوئے اِس کفن پوش مردے کو حکیم کے گھر کے سامنے کھڑے دیکھا تھا اور کس طرح اُسے اُس کے منہ سے نکلنے والی چنگارڈوں نے ہلاک ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر اُس نے کس طرح پرانے قبرستان تک اِس مردے کا تعاقب کیا تھا۔

''میرے خیال میں رات ہوتے ہی اِس مردے میں کوئی بدروح سما جاتی ہے جس کی خوراک غالباً انسانی خون ہے۔ اِس بدروح سے اگر چھٹکارا حاصل نہ کیا جاسکا تو بعید نہیں کہ یہ گاؤں کی آبادی کو ہلاک کرڈالے۔ اِسی لئے میں نے مناسب سمجھا کہ ہمسایہ گاؤں جا کر مولوی صاحب کو یہاں لے آؤں کیونکہ بدقسمتی سے ہمارے گاؤں میں کوئی عالم دین نہیں''

کریمو نے کہا۔

کریمو کی باتوں اور گاؤں میں مولوی صاحب کی آمد نے گاؤں بھر میں کھلبلی مچادی۔ اِس خبر نے کہ ایک بے جان مردہ راتوں کو اپنی قبر سے نکل کر گاؤں ... کو اپنا شکار بناتا پھر رہا تھا۔ گاؤں کے لوگوں کو بُری طرح لرزا دیا۔ مولوی صاحب اُنہیں فرشتہ رحمت دکھائی دینے لگے جو اللہ کی طرف سے اُنہیں اِس بلا سے نجات دینے کیلئے اُن کے گاؤں پہنچے تھے۔ وہ اپنے گھروں سے نکل کر اُن کے گرد جمع ہوگئے۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ آخری مولوی صاحب اُن کے گاؤں کو اِس بلا سے نجات دینے کیلئے کیا کرنے والے ہیں۔

مولوی صاحب نے کریمو سے کہا کہ وہ اُنہیں اُس پرانے قبرستان لے چلے جہاں اُس بھیانک مردے کی قبر تھی۔ اُن کے ساتھ ہی گاؤں کے لوگ بھی چل پڑے۔ پرانے قبرستان پہنچ کر کریمو نے دُور سے مولوی صاحب کو اُس مردے کی قبر دکھائی۔ آگے بڑھنے کی ہمت نہ اُس میں تھی اور نہ کسی اور آدمی میں۔ مولوی صاحب زیرلب کچھ قرآنی آیات پڑھتے ہوئے اُس قبر کی طرف بڑھ گئے۔ اُنہوں نے اِس طرح کچھ پڑھتے ہوئے قبر کے گرد ایک دائرہ کھینچا اور ایک طرف ہٹ کر قرآنی آیات پڑھنے لگے۔

تھوڑی ہی دیر میں اُسی ٹوٹی پھوٹی قبر میں سے کسی کے چیخنے چلانے کی دردناک آوازیں بلند ہونے لگیں...

آوازیں ایسی بھیانک اور لرزا دینے والی تھیں کہ بہت سے لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔کئی لوگوں پر فرطِ خوف و دہشت کے غشی طاری ہونے لگی۔پھر ایک دم ہی قبر کے کھلے ہوئے دہانے سے ایک بہت بڑی خوفناک چمگادڑ باہر نکلی اور قبر کے گرد کھینچے ہوئے دائرے کے اندر ہی اندر چکرانے لگی۔اِس چمگادڑ کی آنکھیں بہت بڑی بڑی اور سرخ سرخ تھیں۔اُس کے سفید نوکیلے دانت باہر نکلے ہوئے تھے۔وہ شدید تکلیف میں مبتلا دکھائی دیتی تھی اور بُری طرح چیخ چلا رہی تھی۔گاؤں کے لوگ اُسے دیکھتے ہی فرطِ خوف سے چیخنے چلانے لگے اور اِدھر اُدھر بھاگ کھڑے ہوئے تھے لیکن مولوی صاحب بدستور اپنی جگہ پر کھڑے قرآنی آیات کا ورد کر رہے تھے۔پھر ایک دم کہیں سے آگ کا ایک شعلہ نمودار ہوا اور اُس چمگادڑ کے پیچھے لپکا۔چمگادڑ بُری طرح چیختی چلاتی آسمان کی طرف اُٹھی۔آگ کا وہ شعلہ بھی اِسی تیزی سے اُس کے تعاقب میں ہولیا۔پھر سب کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ منحوس چمگادڑ اور آگ کا شعلہ آسمان کی انتہائی بلندیوں پر جا کر نظروں سے غائب ہوگئے۔مولوی صاحب نے اِسی طرح قرآنی آیات کا ورد کرتے ہوئے قبر کے گرد کھینچا ہوا دائرہ عبور کیا اور قبر کے کھلے ہوئے سرہانے کی طرف منہ کر کے زور زور سے چند پھونکیں ماریں۔قبر سے دھواں سا اُٹھا۔پھر آگ لگ گئی۔مولوی صاحب وہاں سے ہٹ کر ایک طرف کھڑے ہوگئے اور اُونچی آواز میں اللہ کا کلام پڑھنے اور اِس آگ کی طرف پھونکیں مارنے لگے۔پھر جب وہ آگ بجھی، دھواں ختم ہوا تو لوگوں نے دیکھا کہ اِس جگہ اُس منحوس قبر کا نام و نشان تک باقی نہ رہا تھا۔وہ جگہ کسی چٹیل میدان کی طرح صاف ہو چکی تھی۔

"وہ بدروح آخر یہاں سے دفعان ہوگئی"

مولوی صاحب نے کہا۔

"اب وہ جہنم کی آگ میں جلنے کیلئے پہنچ چکی ہے۔تم لوگوں نے آگ کا جو شعلہ اُس کے تعاقب میں دیکھا تھا وہ جہنم کا شعلہ تھا جو اُس کے اصل ٹھکانے یعنی جہنم کی طرف اُسے گھیر لے گیا۔

"مولوی صاحب! یہ بدروح کس شخص کی تھی؟ اِس نے آخر ہمارے گاؤں کو ہی کیوں اپنی شکار گاہ بنالیا"

چوہدری صاحب نے پوچھا۔

"چلو میں یہ باتیں چوپال میں چل کر بتاتا ہوں"......

مولوی صاحب نے کہا۔پھر جب سب لوگ چوپال میں جا کر جمع ہوگئے تو مولوی صاحب نے اُنہیں

بتایا کہ وہ بدروح ایک نہایت بُرے اور بدکردار خوفو کی بدروح تھی جو اِدھر بھٹکتی پھر رہی تھی۔ ہر اِس جگہ کو اپنا مسکن بنالیتی تھی جہاں کے لوگ اللہ کی یاد سے غافل اور اِس سے سرکشی اختیار کیئے ہوئے ہوتے تھے۔ یہ بدروح اُنہیں طرح طرح سے ستاتی اور اُنہیں تکلیفیں پہنچاتی تھی۔ اِس طرح بھٹکتے بھٹکاتے یہ اِس گاؤں میں آبسی تھی کیونکہ یہاں کوئی اللہ و رسول ﷺ کا نام لیوا نہ تھا۔ سب لوگ زمانہ قبل اسلام کے کافروں کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ اِس بدروح کی شکارگاہ بننے کیلئے اِس گاؤں کے حالات نہایت سازگار تھے۔ چنانچہ اُس نے یہاں ایک پرانی قبر کو اپنا مسکن بنالیا اور رات کو ایک کفن پوش مردے کے روپ میں یہاں کے باشندوں کو اپنا شکار بنانے لگی۔

"اب تم لوگوں نے دیکھ لیا ہے کہ وہ بدروح کیسے کلام اللہ کی قوت سے اِس جگہ سے ہمیشہ کیلئے دفعان ہوگئی ہے۔ اب وہ قیامت تک جہنم کی آگ میں جلتی رہے گی۔ جس جگہ اللہ کا ذکر کیا جائے، شعائرِ اسلامی کی پابندی کی جائے، وہاں اللہ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوتی ہیں۔ کوئی بھوت پریت یا بدروح وہاں کا رخ نہیں کرتی۔ اب میں تم لوگوں کو ہدایت کرتا ہوں کہ تم لوگ اپنے کافرانہ طور طریقے چھوڑ دو۔ سچے مسلمان بن جاؤ، اسلامی شعائر کی پابندی کرو۔ اِس طرح اللہ بھی تم سے خوش ہوگا اور تم ہر بلا اور ہر آفت سے بھی محفوظ و مامون رہو گے"

مولوی صاحب نے کہا۔ چنانچہ مولوی صاحب کے کہنے پر گاؤں کی مدت دراز سے بند پڑی مسجد کھول دی گئی۔ اُس کی صفائی ستھرائی کی گئی۔ مولوی صاحب لوگوں کو نماز اور قرآن شریف پڑھانے لگے۔ اُنہیں اسلامی تعلیمات دینے لگے۔

یوں تھوڑے ہی عرصے میں گاؤں کے لوگ اپنے بھولے ہوئے راستے پر چلنے لگے اور پکے مسلمان بن گئے۔ وہ باقاعدہ مسجد میں جا کر نماز پڑھنے لگے۔ اُن کے گھروں میں قرآن حکیم پڑھا جانے لگا۔

وہ روزے باقاعدگی سے رکھنے اور زکوٰۃ کی ادائیگی کرنے لگے۔ حج کو بھی جانے لگے۔ اسلامی شعائر کی پابندی سے اُن کا گاؤں تھوڑے ہی عرصہ میں ایک مثالی گاؤں بن گیا۔

کالے محل کا مُردہ

تحریر: ضیاء ساجد

منور، ارشد اور حمید جس قصبے میں رہتے تھے وہ گیارہ بارہ سو سال پرانا تھا۔ اُس سے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُسے رگھو جی راجہ نے آباد کیا تھا۔ رگھو جی راجہ سردیوں کے موسم میں اپنی دو سو رانیاں، پانچ سو بیٹے اور بیٹیاں اور دس ہزار سپاہی لے کر اِس قصبے میں آجاتا تھا اور پھر پوری سردیاں یہیں پر گزارتا تھا کیونکہ اِس علاقے میں گرمی

خوب پڑتی تھی۔ رگھو جی راجہ نے اپنے سپاہیوں اور نوکروں چاکروں کیلئے جو مکانات بنوائے تھے وہ تو تباہ وبرباد ہو گئے تھے البتہ اپنے لئے اُس نے جو محل تعمیر کرایا تھا اُس کے کھنڈر ابھی تک قصبے کی آبادی سے تین کوس دُور خشک پہاڑیوں پر موجود تھے۔ اِن کھنڈرات کا رنگ کالا سیاہ ہو چکا تھا اور اِن کی ٹوٹی پھوٹی دیواریں دیکھ کر بہادر سے بہادر شخص کا دل بھی دہل جاتا تھا۔ اِن پہاڑیوں کی طرف دن کے وقت بھی کوئی ڈر کے مارے نہیں جاتا تھا۔ اندھیری راتوں میں اِس محل کے کھنڈروں سے بڑی خوفناک آوازیں اُٹھتی تھیں جنہیں سن کر قصبے کے لوگ تو کجا جانور اور پرندے بھی کانپ اُٹھتے تھے۔

منور، حمید اور ارشد جب سکول میں اکٹھے ہوتے تھے تو آپس میں صلاح کرتے تھے کہ ایک روز اِس کالے محل کی سیر کر کے لوگوں کا خوف دُور کرنا چاہیے۔ اُن کا خیال تھا کہ قصبے کے لوگ بلاوجہ پرانے محل سے ڈرتے ہیں۔ رات کو جو ڈراؤنی آوازیں اِن پہاڑیوں کی طرف سے آتی ہیں وہ اصل میں گیدڑوں، بھیڑیوں اور دوسرے پہاڑی جانوروں کی ہوتی ہیں۔ وہ تینوں ایک تو لوگوں کا خوف ختم کرنے کی خاطر کالے محل میں جانا چاہتے تھے۔ دوسرے اِس لئے بھی رگھو جی راجہ کے محل کے کھنڈرات میں جانا چاہتے تھے تاکہ راجہ کے خزانے پر قبضہ کر سکیں۔ اُنہیں یقین تھا کہ رگھو جی راجہ کا [illegible] خزانہ محل کے تہہ خانے میں ابھی تک پڑا ہوا ہے۔ تینوں لڑکے کالے محل کی تلاشی لینے کا ارادہ تو روز کرتے تھے لیکن ابھی تک جا نہیں پا رہے تھے۔

آخر کار ایک دن حمید نے منور اور ارشد سے کہا کہ یار ہم کئی دنوں سے کالے محل کے اندر جانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں مگر جاتے نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اِس کی وجہ یہ ہے کہ دل میں ہم بھی ڈرتے ہیں کہ کہیں کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں لہٰذا آئندہ سے کالے محل کا ذکر نہیں کیا جائے گا بلکہ ہم اور باتیں کیا کریں گے۔ حمید کا یہ طعنہ سن کر ارشد اور منور غصہ کھا گئے۔ اُنہوں نے کہا جھٹ کہا کہ اِس کا مطلب ہے کہ تم ہمیں بزدل سمجھتے ہو۔ اگر یہ بات ہے تو ہم آج ہی کالے محل جائیں گے۔ اِس کے بعد تینوں دوست خاموش ہو گئے اور شام ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

طے اُنہوں نے یہ کیا تھا کہ جونہی سورج غروب ہو گا تو ہم اپنے اپنے گھروں سے چوری نکل کر قصبے کے باہر کالے محل کی طرف جو گھنا اور پرانا پیپل کا درخت ہے، اُس کے نیچے آجائیں گے جہاں سے کالے محل کی جانب

سفر شروع ہو جائے گا لہٰذا شام کا اندھیرا پھیلا تو وہ اپنے اپنے گھر والوں کی نظر بچا کر باہر نکلے اور پیپل کے درخت کے نیچے اکٹھے ہو گئے۔ منصوبے کے مطابق وہ اپنے اپنے گھر سے دیا سلائی، موم بتی اور کلہاڑی لے کر آئے تھے۔ کالے محل کی سمت روانہ ہونے لگے تو اُن کے دلوں کی دھڑکن تیز ہو گئی اور اُن کی ٹانگیں کانپنے لگیں لیکن اُنہوں نے ایک دوسرے پر اپنی بزدلی ظاہر نہ کی۔ وہ خاموشی سے اِس پتھروں کی تنگ سی پرانی سڑک پر چلتے رہے جو کالے محل کے کھنڈرات کو جاتی تھی۔

اندھیرا آہستہ آہستہ گہرا ہوتا جا رہا تھا اور جھینگروں، ٹڈیوں، مینڈکوں اور دوسرے کیڑے مکوڑوں کی مکروہ آوازیں تیز اور ڈراؤنی ہوتی جا رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ بے شمار بھتنے اکٹھے ہو کر بین کر رہے ہوں۔ پھر یکا یک محل کے کھنڈرات سے ہیبت ناک آوازیں اُبھریں اور ویران پہاڑوں میں گونجنے لگیں۔ وہ آوازیں ایسی تھیں جیسے بہت سے مرد، عورتیں اور بچے دھاڑیں مار مار کر رو رہے ہوں۔ منور، ارشد، اور حمید نے اِن آوازوں کو سنا تو اُن کے دل دہل گئے۔ وہ آوازیں لحظہ بہ لحظہ اُونچی ہوتی گئیں۔ وہ تینوں جوں جوں آگے بڑھتے گئے اِن آوازوں میں بھی زور پیدا ہوتا گیا۔ وہ سمجھے کہ جیسے محل سے نکل کر رونے والے عورتیں، بچے اور مرد اُن کی طرف آ رہے ہیں۔ اِس سے اُن کے پسینے چھوٹ گئے اور اُنہوں نے واپس بھاگ جانے کا سوچا۔ خوف کے مارے اُنہوں نے ایک دوسرے کے بال مضبوطی سے پکڑ لئے اور لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ اُس وقت اندھیرا بہت بڑھ گیا تھا اور بنجر پہاڑیاں ایسی لگ رہی تھیں جیسے بڑے بڑے دیو بیٹھے ہوں۔

تبھی محل کے کھنڈرات میں سے اُنہوں نے آگ کے سرخ اور پیلے شعلے اُٹھتے دیکھے۔ وہ شعلے کبھی روتی ہوئی عورتوں کا ہجوم بن جاتی اور کبھی چیختے چلاتے بچوں کی بھیڑ بن جاتے اور کبھی گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے مردوں کا مجمع بن جاتے۔ حمید، ارشد اور منور کی اِن ہولناک اور شکلیں بدلتے شعلوں کو دیکھ کر رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ اُنہوں نے سوچا کہ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ اِس کالے محل پر بد روحوں کا قبضہ ہے، ہم خوامخواہ اِدھر آ نکلے ہیں اب کیا کریں۔ تینوں نے اپنے بے وقوفی پر اپنے آپ کو کوسا اور قدم روک لئے کہ اچانک اِن آگ کے شعلوں میں سے بچوں، عورتوں اور مردوں کے ڈھانچے نکل کر اُن کی طرف چل پڑے۔ یہ بھیانک منظر دیکھ کر تینوں دوستوں کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ یک دم واپس

بھاگ پڑے۔

افراتفری کے عالم میں جونہی وہ واپس بھاگے اُن کے پاؤں پتھروں سے ٹکرائے اور اُنہوں نے قلابازیاں کھانی شروع کر دیں۔ اِس کے ساتھ ہی وہ بے ہوش ہوگئے۔ دوبارہ ہوش آیا تو اُنہوں نے اپنے آپ کو کالے محل کے کھنڈروں میں پایا۔ وہ قریب قریب ہی لیٹے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کو چھو کر پہلے تو خوف سے اُن کی چیخیں نکل گئیں۔ پھر اُنہوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا اور اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

محل کے کھنڈروں میں اندھیرا اِس قدر گاڑھا تھا کہ اُنہیں اپنا ہاتھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بیٹھ کر اُنہوں نے ایک دوسرے سے سرگوشی میں پوچھا کہ یار ہمیں یہاں کون لایا ہے۔ ہم تو باہر پہاڑیوں پر جا گرے تھے۔ حمید نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا:

"ضرور ہمیں چڑیلیں اُٹھا کر لائی ہیں اور اب وہ ہمیں کھا جائیں گی"

منور رونے والی آواز نکال کر بولا:

"بھوت ہمیں یہاں لائے ہیں۔ اُنہوں نے ہمیں کھانا ہے"......

ارشد نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا:

"میرا خیال ہے بدروحیں ہوں گی جو [illegible] ہیں۔ اب وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گی۔ ہم نے یہاں آ کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اب کیا کریں"

وہ یہ کھسر پھسر کر رہے تھے کہ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ اچانک زمین سے نکلا اور اُن کے قریب سے گزر کر ایک زوردار چیخ مار کر غائب ہوگیا۔ اِس ڈھانچے سے ڈر کر وہ اپنی جگہ سے اُچھلے اور جدھر منہ اُٹھا اندھیرے میں بھاگ پڑے۔ بھاگتے بھاگتے منور کا پاؤں ایک بڑے سے پتھر سے ٹکرایا اور وہ کئی فٹ تک اُچھل گیا۔ پھر اِس سے پہلے کہ وہ دوبارہ زمین پر گرتا اُسے ایک ہڈیوں کے ڈھانچے نے بازو پھیلا کر اپنی بانہوں پر سنبھال لیا۔ یہ دیکھ کر منور کی رگوں میں خون خشک ہوگیا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔ دوسری طرف ارشد جونہی اندھا دھند بھاگا اُس کی ٹکر بھی ایک ہڈیوں کے ڈھانچے سے ہوئی اور اُسے بھی اِس ڈھانچے نے بازوؤں میں بھینچ کر بے ہوش کر دیا۔ حمید کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اُسے بھی ایک ہڈیوں کے ڈھانچے نے قبضے میں لے کر بے ہوش کر دیا۔ یوں تینوں دوست ایک بار پھر بے ہوش ہوگئے۔

اب کی بار وہ ہوش میں آئے تو وہ ایک تنگ و تاریک تہہ خانے میں پڑے تھے۔ وہ تہہ خانہ بدبو سے

بھرا ہوا تھا۔ ایسی بدبو سے جیسی گوشت گل سڑ جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اِس مرتبہ بھی تینوں ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے ہوش میں آخر ایک دوسرے کو ٹٹولا اور بولنے کی کوشش کی لیکن خوف کی شدت سے اُن کی آواز گلے سے نہ نکلی۔ اِس سے اُن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اُنہیں پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ اِس وقت کس جگہ پر ہیں اور یہ بو جس سے دماغ پھٹ رہا ہے کس شے کی ہے۔ اِسی لمحے تہہ خانے کی تاریکی میں ایک مشعل روشن ہوگئی۔ وہ مشعل اپنے آپ تہہ خانے میں گردش کرنے لگی۔

حمید، منور اور ارشد نے مشعل کو تہہ خانے میں گھومتے دیکھا تو اُن کے سانس خشک ہوگئے۔ مشعل کی روشنی میں اُنہیں تہہ خانے کا فرش نظر آیا۔ فرش پر ہڈیوں کے ڈھانچوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اِن ڈھانچوں کے ساتھ موٹے موٹے چیونٹے چمٹے ہوئے تھے۔ اِن کے علاوہ اُنہیں فرش پر بچھو اور سانپ رینگتے ہوئے دکھائی دیئے۔ یہ ہولناک منظر دیکھ کر اُن کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ وہ اُٹھ کر بھاگنے لگے مگر اُن کی ٹانگوں میں جان ہی نہ رہی۔ اُنہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آنکھوں کے علاوہ اُن کے بدن کے باقی اعضا پر فالج گر گیا ہے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِس بھیانک منظر کو دیکھ رہے تھے کہ ایک شیش ناگ پھنکارتا ہوا اُن کی طرف بڑھا۔ وہ اِس زہریلے سانپ کو اپنی جانب آتا دیکھ کر شدت غم سے رو دیئے۔ قریب تھا کہ وہ ناگ اُنہیں ڈس لیتا ایک ڈھانچہ اُچھل کر کھڑا ہوگیا اور اُس نے اُس سانپ کی گردن پر پاؤں رکھ کر اُسے مار دیا۔ اِس کے بعد وہ ڈھانچہ پھر تہہ خانے کے فرش پر دھڑام کر کے گر گیا۔ تینوں دوست ڈھانچے کی اِس حرکت پر حیران رہ گئے اور سوچنے لگے کہ ڈھانچے نے اُنہیں سانپ سے کیوں بچایا ہے۔ کیا بدروحیں ہمیں ڈرا ڈرا کر مارنا چاہتی ہیں۔

ابھی وہ یہی سوچ رہے تھے کہ اِن ڈھانچوں نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ اُن کے رونے کی آواز ویسی ہی تھی جیسی وہ اکثر اپنے گھروں میں کالے محل کی طرف سے آتی سنتے تھے۔ ڈھانچے اتنی زور سے بین کر رہے تھے کہ منور، ارشد اور حمید کے کان درد کرنے لگے۔

اُنہوں نے مشعل کی روشنی میں بھاگنے کا راستہ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ وہ راستہ اُنہیں اپنے دائیں ہاتھ دکھائی دیا۔ وہ تنگ سیڑھیوں سے جو اُوپر جا رہی تھیں اُس سے اُنہیں پتہ چل گیا کہ وہ محل کے تہ خانے میں پڑے

ہوئے تھے۔ پھر وہ دل ہی دل میں اللہ کو یاد کرنے لگے۔ اِس سے یہ ہوا کہ اُن کے مردہ حوصلے پھر سے زندہ ہوگئے۔ اُنہوں نے محسوس کیا کہ اُن کے جسم میں دوبارہ طاقت پیدا ہوگئی ہے۔ یقین کرنے کیلئے اُنہوں نے اپنے ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں ہلا کر دیکھیں تو وہ ہل پڑیں۔ چنانچہ اُنہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور فوراً اُٹھ کر تہہ خانے کی سیڑھیوں کی سمت بھاگ پڑے۔

ابھی وہ سیڑھوں تک پہنچے ہی تھے کہ تہہ خانے کی مشعل آپ ہی آپ بجھ گئی اور ہر طرف گھپ اندھیرا چھا گیا مگر تینوں دوستوں نے اِس کی پرواہ نہ کی اور تہہ خانے کی سیڑھیاں جلدی جلدی طے کرنے لگے۔ جونہی وہ آخری سیڑھی طے کر کے کھلی جگہ پر آئے اُنہوں نے اپنے پیچھے ہڈیوں کے ڈھانچوں کی سیڑھیوں کی جانب آوازیں سنیں۔ ڈھانچے رونا بند کر کے اُن کے تعاقب میں چل پڑے تھے۔ تینوں دوستوں نے ڈھانچوں سے بچنے کیلئے اندھیرے میں ہی ایک جانب اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا۔ ابھی وہ تھوڑی دُور ہی گئے ہوں گے کہ اُنہوں نے ہڈیوں کے تین لمبے لمبے ڈھانچے اپنی راہ میں کھڑے پائے۔ اِن ڈھانچوں کے ہاتھوں میں بھاری تلواریں تھیں۔ اِس پر وہ بائیں ہاتھ دوڑنے لگے۔

اُنہیں پھر یک دم رک جانا پڑا کیونکہ وہاں بھی ہڈیوں کے تین چھوٹے چھوٹے ڈھانچے اُن کی راہ روک کر کھڑے تھے۔ اِن ڈھانچوں نے ہاتھ میں گرز اُٹھا رکھے تھے۔ سارے راستے بند دیکھ کر اُن کا دل بیٹھ گیا اور وہ چکر کھا کر زمین پر گر گئے اور ایک مرتبہ پھر بے ہوش ہوگئے۔

کافی دیر بعد اُنہیں ہوش آیا تو وہ ایک بڑے سے کمرے میں پڑے ہوئے تھے۔ اِس کمرے کی دیواروں کے ساتھ مشعل جل رہی تھی۔ اُنہوں نے مشعلوں کی مدھم روشنی میں آنکھیں اُٹھائیں تو یہ دیکھ کر اُن کی روح کانپ اُٹھی کہ اُن کے سامنے ایک اُونچے چبوترے پر ایسا ڈھانچہ کھڑا تھا جس کی ایک ٹانگ، ایک بازو اور آدھے چہرے کا گوشت اور کھال بالکل سلامت تھے۔ اِس ڈھانچے نے اُنہیں مخاطب کر کے کہا:

"بچو! ہم بہت برسوں سے انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے روز رات کو زور زور سے روتے تھے لیکن کوئی انسان اِدھر نہیں آتا تھا۔ تمہارا بہت شکریہ کہ تم اِدھر آئے ہو۔ تم پوچھو گے کہ میں کون ہوں تو سنو۔ میرا نام رگھو جی راجہ ہے۔ یہ محل میں نے ہی تعمیر کرایا تھا۔ یہ ہڈیوں کے ڈھانچے جنہیں تم نے محل کے اندر جگہ جگہ دیکھ.....

یہ میرے پہرے دار، غلاموں اور بیوی بچوں کے تھے۔ دن کے وقت چونکہ اِس علاقے میں بہت دھوپ پڑتی ہے۔ اِس لئے سارے ڈھانچے بے ہوش پڑے رہتے ہیں مگر رات کے اندھیرے میں یہ اُٹھ جاتے ہیں اور تکلیف کی وجہ سے رونے لگتے ہیں۔ مجھ سے اِن کا رونا دیکھا نہیں جاتا کیونکہ اِن کی یہ جو حالت ہوئی ہے وہ میری ہی وجہ سے ہوئی ہے۔ میں نے ایک مسلمان صوفی کی بے عزتی کی تھی جس کی بددُعا سے محل میں آگ لگ گئی اور ہم سب اُس میں جل گئے تھے۔ ہوا یہ تھا کہ ایک روز ایک مسلمان درویش میرے محل کے دروازے پر آیا اور کہنے لگا کہ میں اُس کی پیاس بجھادوں۔

میں نے ملازموں کو حکم دیا کہ اِس فقیر کو شربت پلاؤ تا کہ اِس کی پیاس بجھ جائے۔ ملازم اُسے شربت پلانے لگے تو اِس کی پیاس بڑھتی ہی گئی یہاں تک کہ محل کا سارا شربت اِس نے پی ڈالا۔ پھر بھی یہی کہتا رہا کہ میری پیاس ابھی باقی ہے۔ اِس پر مجھے بڑا غصہ آیا اور میں نے اُسے دربار میں طلب کر کے ڈانٹا کہ تمہاری پیاس کیوں نہیں بجھ رہی۔ جواب میں اُس نے گستاخ لہجے میں کہا:

"راجہ! تمہاری بھی پیاس نہیں بجھ رہی۔ تم بھی تو مال و دولت اکٹھا کرتے ہی جارہے ہو"

اِس جواب کو سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں نے اِس فقیر کو محل کے اندھے کنوئیں گرا دیا۔ وہ فقیر جونہی کنوئیں میں گرا تو محل میں اچانک آگ بھڑک اُٹھی جس نے ہر شے کو جلا کر راکھ کر دیا......

وہ دن اور آج کا دن اُس فقیر کی بددُعا کے باعث ہم بہت اذیت میں ہیں۔ ہر تیسرے روز یہاں آگ بھڑک اُٹھتی ہے اور ہم سب اُس میں جلنے لگتے ہیں۔ تم مہربانی کر کے محل کے پرانے کنوئیں میں سے اُس نیک فقیر کی لاش نکال کر عزت سے دفن کر دو۔ مجھے اُمید ہے کہ اِس کے بعد ہمارا عذاب ختم ہو جائے گا"

یہ کہہ کر رگھو جی راجہ غائب ہو گیا۔ منور، ارشد اور حمید نے خود کو اُس جگہ پایا جہاں وہ سب سے پہلے گر کر بے ہوش ہوئے تھے۔ اِس کا مطلب تھا کہ یہ سب کچھ اُنہوں نے خواب میں دیکھا تھا۔ اُس وقت صبح ہو رہی تھی۔ وہ تمام رات بے ہوش پڑے رہے تھے۔

دن نکلا تو وہ نڈر ہو کر کالے محل میں گئے اور وہاں اُنہوں نے مردہ فقیر کا ڈھانچہ رسے کی مدد سے کنوئیں سے نکال کر اچھی جگہ دفن کر دیا جس کے بعد کالے محل سے ڈراؤنی آوازیں اُٹھنی بند ہو گئیں۔ اِس طرح کالے محل کی پراسرار کہانی کا اختتام ہو گیا۔

شکاری خود شکار بنے جا رہا ہے۔

مرزا اُوٹ پٹانگ کا سفر کراچی

اختر وقار عظیم

سکول کا امتحان دینے کے بعد مرزا اُوٹ پٹانگ کو چھٹیاں ہوئیں تو وہ ضد کرنے لگے کہ میں اِن چھٹیوں میں ذرا کراچی تک کا دورہ کر آؤں۔ گھر والوں اور دوستوں کے کہنے سے جب مرزا صاحب نہ مانے اور اِسی ضد پر اڑے رہے کہ میں تو کراچی کا دورہ ضرور کروں گا، تب مجبوراً گھر والوں نے اُنہیں کراچی جانے کی اجازت

دے دی۔

دو تین دن بعد مرزا صاحب کراچی جانے کیلئے تیار ہو کر اسٹیشن پہنچے، مرزا صاحب کے دوست بھی اُنہیں خدا حافظ کہنے اسٹیشن پر آئے تھے، میں نے مرزا صاحب سے کہا:

"مرزا صاحب! کراچی میں میرا ایک دوست جمیل رہتا ہے۔ آپ ذرا اُس سے ملتے آئیے گا"

وہ کہنے لگے:

"اپنے دوست کا پتہ لکھ دو، ہم اُس سے ضرور مل کر آئیں گے"

میں نے مرزا صاحب کو پتہ لکھ کر دے دیا۔ مرزا اُوٹ پٹانگ کو ہم نے انٹر کے ڈبے میں بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر بعد جب گاڑی کراچی کیلئے روانہ ہوگئی تو ہم سب دوست اسٹیشن سے واپس آگئے۔

کچھ دنوں بعد مرزا صاحب کراچی سے واپس لوٹے، ہم نے اُن سے کراچی کی سیر کے بارے میں پوچھا، مرزا صاحب نے کراچی کے دورے کے کچھ قصے سنائے۔ ذرا آپ بھی سنیئے:

❖......❖

کراچی کے سفر میں مرزا اُوٹ پٹانگ کو بھوک لگی۔ جب گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو مرزا صاحب نے ایک انڈے والے کو بلایا اور اُس سے کہا:

"اے بھائی! انڈے والے ہمیں چھ عمدہ عمدہ انڈے دے دو"

انڈے والے نے کہا:

"جی ہاں صاحب! عمدہ ہی انڈے دوں گا، میرے پاس عمدہ ہی انڈے ہوتے ہیں، خراب نہیں ہوتے"

مرزا صاحب کب چپ رہنے والے تھے، کہنے لگے:

"ہاں ہاں! میں جانتا ہوں۔ آپ گندے انڈے اپنے پاس نہیں رکھتے بلکہ وہ گاہکوں کو دیتے ہیں لیکن ہمیں گندے انڈے نہ دینا۔ بھئی ہم مسافر ہیں"

❖......❖

ایک زندہ دل آدمی جو مرزا اُوٹ پٹانگ کے ساتھ سفر کر رہا تھا، مرزا صاحب کی ٹوپی اُٹھا کر چھپالی اور کہا کہ ریل سے باہر اُڑ گئی ہے۔ جب مرزا صاحب رونے لگے تو اُس نے کہا:

"ٹھہرو! میں سیٹی بجاتا ہوں۔ ابھی آجائے گی"

اُس آدمی نے سیٹی بجائی اور چپکے سے مرزا کی ٹوپی

اُن کے سامنے ڈال دی۔ مرزا اُوٹ پٹانگ اُس کی چالاکی تاڑ گئے۔ اُنہوں نے اُس شخص کی پاس ہی رکھی ہوئی ٹوپی اُٹھائی اور کھڑکی سے باہر پھینک دی۔ وہ شخص خوب چلایا:

"کم بخت یہ کیا کیا تُو نے؟"

مرزا اُوٹ پٹانگ نے سادگی سے جواب دیا:

"گھبراؤ نہیں، ابھی سیٹی بجاتا ہوں تمہاری ٹوپی واپس آجائے گی"

مرزا کی اِس چالاکی پر وہ شخص روتے روتے ہنس پڑا۔

◆......◆

خدا خدا کر کے مرزا اُوٹ پٹانگ کراچی پہنچ گئے۔ کراچی پہنچ کر اُن کا دل چاہا کہ شہر کی سیر کی جائے۔ آپ اپنے ایک رشتے دار کے گھر سامان رکھ کر شہر کی سیر کو نکلے۔ سب سے پہلے آپ بندر روڈ پہنچے۔ وہاں پر آپ نے دیکھا کہ ایک دوکان پر شیشے لگے ہیں اور اُن کے پیچھے بہت خوبصورت چیزیں رکھی ہیں۔ آپ اُنہیں دیکھنے کیلئے آگے بڑھے۔ اتفاق سے ٹھوکر لگنے سے شیشہ ٹوٹ گیا۔ مرزا اُوٹ پٹانگ نظر بچا کر بھاگے اور سمجھے کہ کسی نے دیکھا نہیں ہے۔ لیکن دوکان دار اُن کے پیچھے بھاگتا آرہا تھا۔ اُس نے اُنہیں پکڑ لیا اور کہا:

ہمارا شیشہ توڑ کر تم کہاں بھاگے جاتے ہو؟"

مرزا اُوٹ پٹانگ حاضر جواب تو ہیں ہی، آپ کہنے لگے:

"ارے بھائی! میں تو شیشے کی قیمت لانے گھر بھاگا جارہا تھا"

◆......◆

اُسی دن کی بات ہے کہ مرزا صاحب کو بہت پیاس لگی۔ آپ کی جیب میں ایک ہی آنہ تھا۔ آپ نے دیکھا کہ ایک آدمی شربت کی بوتل پی رہا ہے۔ آپ اُس سے کہنے لگے:

"بھئی مجھ سے ایک ایک آنے کی شرط لگالو، میں یہ بوتل ایک ہی سانس میں ختم کرسکتا ہوں"

دوسرے شخص نے یہ شرط منظور کرلی۔ اِس پر مرزا اُوٹ پٹانگ نے شربت کی بوتل اُٹھا کر غٹا غٹ شربت پینا شروع کردیا اور جلد ہی اُسے ختم کردیا اور اِس کے بعد وہ صاحب اکنی میز پر رکھتے ہوئے فرمانے لگے:

"صاحب آپ جیتے، یہ لیجیے اکنی حاضر ہے"

اِس طرح چالاکی سے مرزا اُوٹ پٹانگ نے اکنی میں شربت کی بوتل پی لی۔

کچھ دن اور کراچی میں رہنے کے بعد مرزا اُوٹ پٹانگ واپس لوٹے، میں اور چند دوست اسٹیشن پر ہی پہنچ گئے۔ گاڑی آئی اور مرزا صاحب مسکراتے ہوئے ڈبے سے باہر نکل آئے۔ ہم نے دیکھا کہ مرزا صاحب کی جیب خوب پھولی ہوئی ہے۔ ایک دوست نے پوچھا:

''مرزا صاحب! یہ آپ کی جیب میں کیا ہے؟''

مرزا صاحب کہنے لگے:

''ارے بھئی کیا بتاؤں، وہ ریل میں ایک آدمی تھا جو ٹکٹ دیکھنے کو مانگتا تھا اور پھر آدھا ٹکٹ پھاڑ کر واپس کر دیتا تھا۔ آخر اتنے ٹکٹ خریدنے کے بعد ایک ثابت ٹکٹ یہاں تک لانے میں کامیاب ہوا ہوں''

میں نے مرزا صاحب سے پوچھا:

''کیوں مرزا جی! میرے دوست سے آپ کی ملاقات ہوئی؟'

مرزا صاحب کہنے لگے: ''جی ہاں''

میں نے پوچھا: ''وہ آجکل کس حال میں ہے؟''

مرزا صاحب کہنے لگے:

''جب میں نے اُسے آخری مرتبہ دیکھا تھا تو اُس کے گلے میں قمیص تک بھی نہ تھی۔

میں نے پوچھا:

''مرزا صاحب! آپ نے اُسے کہاں دیکھا تھا؟''

مرزا صاحب کا جواب تھا:

''سمندر میں نہاتے ہوئے......!''

یہ تھا مرزا اُوٹ پٹانگ کا کراچی تک کا سفر، اب دیکھئے آئندہ وہ کیا گل کھلاتے ہیں۔

یونان کی شہزادی

مقبول احمد دہلوی

بہت پرانے زمانے کی بات ہے کہ ملک یونان میں ایک بادشاہ تھا۔ اُس کا ایک بیٹا تھا، بادشاہ اور ملکہ اپنے اکلوتے بیٹے کو بے حد چاہتے تھے۔ جب شہزادہ بڑا ہوا تو بادشاہ اور ملکہ نے اُس کی شادی کرنا چاہی مگر شہزادے نے شادی سے صاف انکار کر دیا۔

بادشاہ نے شہزادے کو سمجھاتے ہوئے کہا:

"بیٹا! میرے بعد تمہیں اِس ملک کا تخت و تاج سنبھالنا ہے۔ اِس لئے جلدی شادی کرلو تا کہ اپنی ملکہ کے ساتھ اِس ملک پر حکومت کر سکو"

شہزادے نے بڑے تحمل سے باپ کی بات سنی لیکن آخر میں نہایت صفائی کے ساتھ نفی میں سر ہلا دیا۔ یہ دیکھ کر ملکہ کو بہت مایوسی ہوئی۔ وہ پیارے بھرے لہجے میں بولی:

"میرے لعل! میرا اتنا بڑا محل دُلہن کے قہقہوں اور بچوں کی کلکاریوں سے اب تک محروم ہے۔ خالی محل مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ شادی کر کے جلدی سے چاند سی دُلہن لاؤ تا کہ محل میں خوشیوں کا راج ہو"

شہزادے پر ملکہ کی باتوں کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ اُس نے کہا:

"ماں! میں شادی نہیں کروں گا"

شہزادے کا یہ جواب سن کر ملکہ نے سوچا۔

"ضرور کوئی بات ہے جو شہزادہ مجھ سے چھپا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ کسی غریب لڑکی کو چاہتا ہے اور ڈر کے مارے ہمیں بتانا نہیں چاہتا۔ اگر ایسی بات ہے تو میں پتہ لگاؤں گی ور جہاں شہزادہ چاہے گا وہیں اُس کی شادی کرو گی چاہے اُس کی ہونے والی دُلہن کسی کسان کی بیٹی کیوں نہ ہو"

اتفاق کی بات ہے کہ شاہی محل کے سامنے ایک کسان کا گھر تھا۔ اُس کے گھر کے چاروں طرف باغیچہ تھا۔ اِس باغیچے میں تین خوبصورت لڑکیوں کو گیند کھیلتے دیکھ کر ملکہ نے اندازہ لگالیا کہ ضرور ہمارا شہزادہ اِن تینوں میں سے کسی ایک کو پسند کرتا ہوگا۔ اُس نے قاصد بھیج کر کسان کی بڑی لڑکی کو محل میں بلوایا۔ جب لڑکی آ گئی تو ملکہ نے کہا:

"بیٹی! میرا خیال ہے کہ شہزادہ تمہیں پسند کرتا ہے مگر یہ بات مجھ سے کہتے ہوئے شرماتا ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے تو تمہیں اپنی دُلہن بنانے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اب تم بتاؤ کہ میری یہ بات درست ہے نا؟"

"رانی جی! میں تو اِس بارے میں قطعاً کچھ نہیں جانتی۔ سچ پوچھیئے تو میں نے شہزادہ صاحب کو آج تک دیکھا تک نہیں"......

کسان کی بڑی لڑکی نے گھبرا کر کہا۔ لڑکی کا یہ جوب سُن کر ملکہ نے چند لمحوں کیلئے سوچا۔ پھر اُسے شہزادے کے مطالعے والے کمرے میں لے گئی اور اُسے ایک آرائشی تخت پر بٹھا کر اُس کے کان میں آہستگی سے کوئی بات کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد

شہزادہ اُس کمرے میں آپہنچا۔ اُس نے کسان کی بڑی لڑکی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ اپنی میز پر بیٹھ کر تھوڑی دیر کچھ لکھتا رہا۔ پھر اُٹھ کر چلا گیا۔ یہ سوچ کی کسان کی بیٹی وہیں بیٹھی رہی کہ اُس کے چلے جانے کے بعد نامعلوم ملکہ کیا کہے گی۔ وہ وہیں تخت پر بیٹھی سو گئی۔ جب وہ سو کر اُٹھی تو سویرا ہو چکا تھا۔ ملکہ نے اُس کے پاس آ کر پوچھا:

"سناؤ بیٹی! شہزادے نے تم سے کیا بات چیت کی؟"

"ملکہ عالیہ! شہزادہ کل شام کچھ دیر کیلئے آئے تھے۔ میز پر بیٹھ کر لکھتے رہے اور پھر چپ چاپ اُٹھ کر واپس چلے گئے۔ مجھ سے اُنہوں نے بات تک نہیں کی"

کسان کی لڑکی نے جواب دیا۔ ملکہ نے اُس لڑکی کو انعام واکرام دے کر واپس اُس کے گھر بھیج دیا۔ دوسری لڑکی کو بھی ملکہ نے اِسی طرح شہزادے کے کمرے میں بٹھایا مگر اُس کے ساتھ بھی وہی واقعہ پیش آیا جو اُس کی بڑی بہن کے ساتھ پیش آیا تھا۔ شہزادے نے اُس سے بات کرنا تو درکنار اُس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ ملکہ نے دوسری لڑکی کو بھی تحفے دے کر رخصت کر دیا۔

تیسرے دن ملکہ نے کسان کی تیسری اور سب سے چھوٹی بیٹی کو شاہی محل میں بلوایا اور وہی باتیں کیں جو اِس سے پہلے اُس کی دونوں بڑی بہنوں سے کر چکی تھی۔ کسان کی چھوٹی بیٹی جتنی حسین اور خوبصورت تھی، اُتنی ہی ذہین اور سمجھدار بھی تھی۔ اُس نے ملکہ سے کہا:

"ملکہ عالیہ! آپ جیسا حکم دیں گی میں کروں گی لیکن پہلے میرے لئے اچھے سے کپڑے تو منگوا دیجیے۔ اِس معمولی سی پوشاک میں، میرا شہزادہ کے سامنے جانا کچھ مناسب نہیں۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے!

ملکہ نے حکم دیا۔ چند کنیزیں دوڑیں آئیں اور کسان کی چھوٹی بیٹی کو اپنے ساتھ لے گئیں اور تھوڑی دیر بعد نہلا دھلا کر عمدہ سی پوشاک اور زیورات پہنا کر لے آئیں۔ ملکہ کسان کی بیٹی کا یہ رنگ و روپ دیکھ کر بہت خوش ہوئی، بولی:

"خدا تمہیں نظرِ بد سے بچائے، سچ مچ تم شہزادی دکھائی دیتی ہو"

کسان کی لڑکی ملکہ کی یہ بات سُن کر شرما گئی۔ ملکہ اُسے اپنے ساتھ شہزادے کے کمرے میں لے گئی اور تخت پر بٹھا کر واپس چلی آئی۔ تھوڑی دیر بعد شہزادہ گھومتا پھرتا اپنے کمرے میں پہنچا۔ شہزادے نے نہ تو لڑکی کی طرف

دیکھا اور نہ اُس سے کسی قسم کی کوئی بات کی۔ میز پر بیٹھ کر موم بتی جلائی اور کچھ لکھنے لگا۔ کسان کی لڑکی نے یہ دیکھ کر شہزادے سے خود بات کرنا چاہی، وہ بولی:

"شہزادے! آپ اچھے تو ہیں"

شہزادے نے اِس بات کا بھی کوئی جواب نہیں دیا ،بس چپ چاپ بیٹھا لکھتا رہا۔ شہزادے کے کمرے میں کھڑکی کے پاس ایک مینا کا پنجرہ لٹکا ہوا تھا۔ کسان کی لڑکی نے مینا سے مخاطب ہو کر کہا:

"بی مینا! تم ہی کچھ بولو، شہزادہ صاحب نے تو شاید نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہے"

مگر لڑکی کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب مینا نے بھی لڑکی کی بات کا جواب نہ دیا۔ تب آخر میں کسان کی لڑکی نے تنگ آ کر موم بتی کو مخاطب ہو کر کہا:

"اچھی موم بتی! کیا تم بھی میرے سوال کا جواب نہ دو گی؟"

شہزادہ یہ سُن کر جھنجلا اُٹھا۔ اُس نے قلم میز پر پٹخا اور کہا:

"موم بتی! تمہیں کیا چاہیے۔ مجھے کیوں پریشان کر رکھا ہے"

یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختا تیزی سے کمرے سے باہر چلا گیا۔ کسان کی چھوٹی بیٹی وہیں تخت پر بیٹھے بیٹھی سو گئی۔

دوسرے دن ملکہ نے آ کر پوچھا:

"سناؤ بیٹی کیا رہا! شہزادے نے تم سے کوئی بات کی؟"

کسان کی لڑکی نے پہلے ہی اِس سوال کا جواب سوچ رکھا تھا، وہ جھٹ بولی:

"ملکہ عالیہ! زیادہ باتیں تو نہ ہوئیں، بس شہزادہ صاحب آئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ تم کون ہو، اور یہاں کیوں آئی ہو؟"

میں نے جواب دیا:

"جی! مجھے ملکہ حضور نے یہاں بھیجا ہے"

یہ سُن کر اُنہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور پھر میرے پاس بیٹھ کر دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے"

ملکہ یہ سُن کر بہت خوش ہوئی۔ اُس نے اندازہ لگا لیا کہ ضرور شہزادہ کسان کی چھوٹی بیٹی کو پسند کرتا ہے۔ اُس نے لڑکی کو شاہی محل ہی میں رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ ملکہ نے کسان کی لڑکی کو دوسرے دن بھی شہزادے کے مطالعے کے کمرے میں بیٹھے رہنے کا حکم دیا۔ کسان کی لڑکی عمدہ پوشاک پہنے شاہی محل کے برآمدے میں ٹہلنے

لگی۔اتنے میں اُس کی دونوں بڑی بہنیں بھی وہاں آگئیں اور بولیں:

"کیوں بہن! کیا تم آج بھی گھر نہیں چلو گی؟"

"نہیں! ملکہ نے حکم دیا ہے کہ میں یہیں شاہی محل میں رہوں"

کسان کی چھوٹی لڑکی نے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ شہزادے نے بھی تم سے کوئی بات کی؟"

اُن لڑکیوں نے پوچھا۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔شہزادہ صاحب کتنی دیر تک بیٹھے مجھ سے باتیں کرتے رہے"

چالاک بہن نے جواب دیا۔

بڑی بہنوں کو چھوٹی بہن کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔اُنہوں نے سوچا کہ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔اچانک اُن کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔وہ ایک سوداگر کے پاس گئیں اور اُس سے موتیوں کی ایک مالا لے آئیں، اِس مالا کو چھوٹی بہن کو دکھا کر بولیں:

"یہ ہار فروخت کیلئے ہے۔کیا شہزادہ یہ ہار تمہارے لئے خرید سکتا ہے؟"

"مجھے دو جاؤ، میں شہزادے سے پوچھ کر جواب دوں گی"

چھوٹی بہن نے بتایا۔

اُس شام کو جب شہزادہ کمرے میں آیا تب کسان کی چھوٹی بیٹی بولی:

"میری بہنیں موتیوں کا ایک ہار بیچنے کیلئے لائی ہیں، کیا میں خرید لوں؟"

شہزادے نے لکھتے ہوئے جواب دیا:

"موم بتی! الماری کی بڑی دراز میں ہے سونے کی اشرفیاں نکال لو"

دوسرے دن اُس نے ملکہ کو بتایا کہ موتیوں کا ہار خریدنے کیلئے شہزادے نے اُسے یہ اشرفیاں دی ہیں۔ملکہ یہ سُن کر اور خوش ہوئی۔تھوڑی دیر میں اُس کی دونوں بڑی بہنیں بھی آگئیں۔

چھوٹی بہن نے اشرفیاں دیتے ہوئے کہا:

"یہ لو، ہار کی قیمت۔شہزادے کو ہار بہت پسند آیا"

یہ سُن کر دونوں بہیں مارے حسد کے جل گئیں۔کچھ سوچ کر بولیں:

"اِس کا مطلب یہ ہے کہ شہزادہ حضور تمہیں اپنی ملکہ بنائیں گے۔کیا شادی سے پہلے تم اُن سے ہمارا تعارف نہیں کرا سکتیں؟"

"آج شام کو میں اُن سے پوچھ لوں گی۔ وہ مان گئے تو ضرور میں تمہیں اُن سے ملوادوں گی"

چھوٹی بہن نے کہا۔ اُس شام جب شہزادہ حسب معمول کمرے میں آیا تو کسان کی لڑکی نے سسکیاں بھر کر رونا شروع کر دیا۔ شہزادہ اُس کے رونے کی آواز سُن کر بولا:

"موم بتی جی روتی کیوں ہو۔ یہاں آؤ"

کسان کی لڑکی یہ سُن کر اُٹھی اور شہزادے کے قریب آ کر کھڑی ہوگئی لیکن شہزادے نے نگاہ اُٹھا کر بھی اُس کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ برابر سر جھکائے لکھتا رہا۔

"موم بتی! میں ایک معمولی سی کنیز اُنہیں کیسے بلا سکتی ہوں۔ بس اِسی بات کو سوچتے ہوئے اپنی قسمت پر آنسو بہا رہا ہوں"

کسان کی لڑکی نے کہا۔ شہزادے نے جواب دیا:

"کوئی بات نہیں، پریشان نہ ہو، تالاب میں بطخیں ہیں، جنگل میں ہرن ہیں، دربار میں شکاری ہیں۔ باورچی خانے میں بے شمار خانسامے ہیں۔ اُنہیں ضرور کھانے پر بلاؤ موم بتی"

اتنی باتیں کہہ کر شہزادے نے قلم میز پر رکھ دیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ لڑکی نے یہ سب باتیں ملکہ کے گوش گزار کیں تو ملکہ نے فوراً ایک شاندار دعوت کا اہتمام کیا۔ کسان کی لڑکی نے اپنی دونوں بہنوں کو کھانے پر بلایا لیکن شہزادے سے تعارف کا مسئلہ وہ پھر بھی حل نہ کر سکی، بالآخر اُس نے اِس بات سے بچنے کیلئے ایک بہانہ پہلے سے سوچ لیا۔

دونوں بڑی بہنیں اچھے کپڑے پہن کر دعوت میں آئیں لیکن اُنہیں وہاں شہزادہ کہیں نظر نہیں آیا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک بہن بولی:

"شہزادہ دکھائی نہیں دے رہے۔ وہ کہاں ہیں؟"

"کیا وہ دعوت میں شریک نہیں ہوں گے؟"

دوسری بہن نے کہا۔

"کیوں نہیں! ضرور شریک ہوں گے۔ صبح سے شکار کھیلنے گئے ہوئے ہیں۔ بس اب آتے ہی ہوں گے"

چھوٹی بہن نے بتایا۔

اُن کے درمیان یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دفعتاً ایک قاصد گھوڑا دوڑاتا ہوا وہاں آیا اور بڑے ادب سے سلام کر کے کسان کی چھوٹی لڑکی سے بولا:

"شہزادہ حضور! آپ کو دو منٹ کیلئے پائیں باغ میں بلا رہے ہیں۔ کوئی ضروری بات کہنا چاہتے ہیں؟"

کسان کی چھوٹی لڑکی اپنی دونوں بڑی بہنوں کو

وہاں چھوڑ کر قاصد کے ساتھ پائیں باغ کی طرف چل دی۔ باغ میں پہنچ کر اُس نے قاصد کو انعام دے کر رخصت کیا۔ وہ خوش تھی کہ یہاں تک اُس کا ڈرامہ کامیاب جا رہا ہے۔ اُس نے سوچا کہ اب وہ بہنوں کے واپس جانے تک یہیں رہے گی اور بعد میں بہنوں سے اپنی اور شہزادے کی غیر حاضری کی معافی مانگ لے گی۔

کسان کی لڑکی پائیں باغ میں چہل قدمی کر رہی تھی کہ اچانک ایک بڑے سے درخت کے تنے میں اُسے روشنی دکھائی دی۔ اُس نے کھوکھلے تنے میں جھانک کر دیکھا تو اُسے وہاں سیڑھیاں نظر آئیں۔ کسان کی لڑکی سیڑھیاں اُتر کر نیچے چلی گئی۔ نیچے اُسے ایک نئی دنیا دیکھنے کو ملی۔ اُس نے دیکھا کہ دریا کا خوبصورت کنارہ ہے۔ دُور ایک عالیشان محل ہے۔ محل کے باغیچے میں شہزادہ، ایک جل پری اور ننھے بچے کے ساتھ لیٹا آرام کر رہا ہے۔

اُنہیں دیکھ کر کسان کی لڑکی ساری بات سمجھ گئی۔ اب اُسے معلوم ہوا کہ شہزادہ کیوں شادی نہیں کرنا چاہتا۔ تینوں کو اِس طرح لیٹے دیکھ کر وہ اندر محل میں گئی۔ وہاں سے گدے، تکیے اور چادریں لے کر دوبارہ باغیچے میں آئی۔ بچے کو اُٹھا کر اُس نے گدوں پر لٹایا اور ریشمی چادر سے ڈھانپ کر اُسے اپنے ساتھ شاہی محل لے آئی اور سارا واقعہ ملکہ کے گوش گزار کیا۔

ملکہ اپنے پوتے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ وہ کسان کی لڑکی کو پوتے کے پاس چھوڑ کر خود بہو کو دیکھنے کیلئے گئی مگر جب وہ پائیں باغ میں درخت کے پاس پہنچی تو وہاں شہزادہ اُداس کھڑا تھا۔ ملکہ کے پوچھنے پر اُس نے بتایا:

"ماں! میں نے ایک جل پری سے شادی کی تھی، ہمارا ایک بچہ بھی تھا۔ میں آپ کو اُن سے ملواتا مگر جل پری کی ایک شرط تھی کہ وہ بھی کسی سے نہیں مل سکتی۔ اگر کبھی کسی نے ملنے کی کوشش کی تو وہ ہمیشہ کیلئے غائب ہو جائے گی۔ آج ہمارے ننھے کو معلوم نہیں کون اُٹھا کر لے گیا۔ جل پری کہتی ہے کہ اِس میں میری شرارت ہے۔ اِس لئے وہ مجھے ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر چلی گئی"

"تُو دل چھوٹا نہ کر بیٹے، آئیں تجھے ایک اور پری سے ملواؤں"

اتنا کہہ کر وہ شہزادے کو ایک کمرے میں لے گئی جہاں کسان کی بیٹی شاہی پوشاک میں ملبوس ننھے شہزادے کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ شہزادے نے آج پہلی بار کسان کی لڑکی کو دیکھا۔ وہ اُسے جل پری سے بھی زیادہ

حسین اور خوبصورت نظر آئی۔ جب اُس نے اپنے بیٹے کو بھی زندہ سلامت دیکھا تو اُس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

اگلے روز دونوں کی شادی ہوگئی اور یوں کسان کی چھوٹی بیٹی اپنی عقل مندی سے ملکہ یونان بن گئی۔ اِس طرح یہ کہانی اختتام پذیر ہوگئی۔

حکیم اقلیدس کی حکمت آموز باتیں

☆ عالم بے عمل اور عبادت گزار بے معرفت دونوں ایک جیسے ہیں۔

☆ جو تیری قسمت میں نہیں اُس کی طلب تجھے افسردہ کردے گی۔

☆ جو شخص علم کے باوجود بے عمل ہو اُس کا شمار اِن مریضوں میں ہوتا ہے جن کی دوا تو ہوتی ہے مگر علاج نہیں کرا سکتے۔

☆ خوشامدیوں سے بچو کیونکہ وہ تجھے کسی بھی جگہ ذلیل کرا سکتے ہیں۔

☆ جو لوگ جلد از جلد دولت مند بننا چاہتے ہیں وہ دراصل لوگوں کا مال ہڑپ کرنا چاہتے ہیں۔

☆ نفس کو قابو میں رکھنے کیلئے کم کھاؤ اور کم سوؤ۔

☆ جو شخص اپنے آپ کو دوسروں سے کم درجہ کا خیال کرے، اُسی کو کم دکھ ملتے ہیں۔

☆ دانا سے مشورہ کر اور دانا وہ ہے جو کم بولے اور زیادہ سنے، جو گردش ایام سے تنگ نہ ہو۔

☆ جو شخص اپنے مال کو بے جا خرچ کرتا ہے جلد غریب ہو جاتا ہے۔

☆ اُس شخص کو ملازم رکھ جو ایماندار اور کام کی سمجھ بوجھ رکھتا ہو، اِس میں کسی کی سفارش قبول مت کر۔

☆ دو بھائیوں میں دشمنی نہ ڈال کہ وہ معمولی بات پر صلح کرلیں اور تجھے بُرائی حاصل ہو۔

☆ عالم بے عمل اور عابد بے معرفت چکی کی مانند ہیں جو شب و روز چکر میں سرگراں ہیں لیکن نہیں جانتے ہیں کہ کس حال میں ہیں۔

مرسلہ: وقاص ظہیر لاہور

شیخ چلی شادی کرنے چلے

تحریر: عبید اللہ محمود

ایک دن شیخ چلی اپنی ماں کے پاس آئے اور بولے:

"اماں میری شادی کردو"

اُس کی ماں اُس وقت

رہی تھی۔ اُس نے حیرت نے اُن کی طرف دیکھا:

"تمہیں شادی کی کیسے سوجھ گئی؟"

"بس اماں! میں نے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا

"مگر بیٹے! تم سے شادی کرے گا کون؟"
اُس کی ماں نے افسردگی سے کہا۔
"اماں! کیا تمہیں مجھ میں کوئی کمی نظر آتی ہے؟"
شیخ چلی نے اکڑ کر پوچھا۔
"نہیں بیٹے!"......اُس کی ماں جلدی سے بولی۔
"میں یہ کہہ رہی تھی کہ ابھی تو تمہارا کسی سے رشتہ طے نہیں ہوا۔ کسی سے بات تو طے کر لینے دو۔"
"اماں! تمہیں کسی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اپنے لئے رشتہ خود ڈھونڈ لیا ہے"
"اچھا"......ماں نے حیرت سے کہا۔ "مگر بیٹے تمہیں اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ تمہارے ابا مرحوم کی بھی یہی عادت تھی کہ ہر کام میں جلدی دکھایا کرتے تھے"
"تو پھر میں کیوں پیچھے رہوں، میں بھی تو اُنہی کا بیٹا ہوں"......شیخ چلی نے فخر سے کہا۔
"میں شادی ضرور کروں گا، اِس کا میں نے فیصلہ کر لیا ہے"
"تو پھر اب مجھ سے کیا کہنے آئے ہو؟"
ماں نے ناگواری سے پوچھا۔
"ماں! تم سے صرف اجازت لینا چاہتا ہوں"
ماں نے بیزاری سے کہا:
"میری طرف سے اجازت ہے"
ماں کی رضامندی معلوم کر کے شیخ چلی کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ اُچھلتے کودتے، ناچتے گاتے کمرے سے صحن کی طرف دوڑے۔ اُن کی ماں اُن کی اِس حرکت کو دیکھ کر اور افسردہ ہو گئی اور بڑبڑائی:
"کاش بیٹے! تم کچھ عقل مند بھی ہوتے"
شیخ چلی سیدھے اپنے گدھے کے پاس پہنچے جو صحن میں ایک چھوٹے سے پیڑ کے نیچے بندھا ہوا تھا۔ اُنہوں نے بڑے پیار سے گدھے کی گردن پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اُسے کھول کر مکان سے باہر لائے۔ گدھے پر سوار ہو کر وہ بازار کی طرف روانہ ہو گئے جو اُن کے گھر سے تھوڑی دُور تھا۔
خیالی پلاؤ پکاتے جب وہ بازار کے نزدیک پہنچے تو اُنہیں خیال آیا کہ وہ پیسے لانے تو بھول ہی گئے ہیں۔
"یار تو اپنی بارات لے کر کیسے جائے گا؟"......اُنہوں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔
"اللہ مالک ہے"......خود ہی جواب دیتے ہوئے وہ گدھے سے اُتر کر بازار میں چلنے لگے۔ اچانک اُن کی نگاہ حلوائی کی دکان پر پڑی جو گرم گرم مٹھائیاں بنا رہا تھا۔ وہ فوراً اُس کی دکان پر پہنچے۔

"ارے بھئی یہ برفی تول دو ایک کلو"

اُنہوں نے اکڑ کر کہا۔

حلوائی نے برفی تول کر اُن کے سامنے رکھ دی۔

"ایک کلو دودھ بھی تول دو"...... شیخ چلی نے کہا۔

حلوائی نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا' کچھ سوچا اور پھر بولا:

"صاحب! دودھ تو ہے نہیں"

"اچھا خیر کوئی بات نہیں' کتنے پیسے ہوئے؟"

شیخ چلی نے پوچھا۔

"چار روپے"...... حلوائی نے بتایا۔

شیخ چلی نے پیسے نکالنے کیلئے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر پھر گھبرا گئے۔ پیسے تو وہ لائے ہی نہیں تھے۔ وہ سوچنے لگے کہ حلوائی کو پیسے کہاں سے دیں۔ اگر وہ برفی واپس کر دیتے تو دلہن کے گھر کیا لے کر جائیں گے۔

"صاحب جی جلدی کریں"...... حلوائی نے اُنہیں خاموش پا کر پیسوں کا مطالبہ کیا۔

"یار پیسے تو ہی نہیں' تم یہ گدھا لے لو"

اُنہوں نے گڑبڑا کر کہا۔

"کیا کہا گدھا لے لوں"...... حلوائی چیخا۔

"اچھا بھائی! ہم ابھی تمہیں پیسے دیتے ہیں"

شیخ چلی نے جلدی سے کہا۔

اچانک اُنہوں نے آواز لگانی شروع کر دی۔ "چھ روپے میں گدھا لے لو"

آناً فاناً اُن کا گدھا بک گیا۔ اُنہوں نے حلوائی کے روپے چکائے اور برفی کا لفافہ اُٹھا کر آگے چل دیئے۔ دو روپے اُن کے پاس بچ گئے۔ اُنہوں نے سوچا کہ اِس سے بھی کوئی چیز خریدنی چاہیے۔ چنانچہ اُنہوں نے ماں کیلئے چار آنے میں ایک پان خریدا۔ باقی پیسوں سے اُنہوں نے ایک موٹی سی مرغی خریدی اور گھر کی طرف چل دیئے۔

گھر پہنچ کر اُنہوں نے پان ماں کے حوالے کیا۔ وہ پان لے کر بہت خوش ہوئی۔ مرغی کو ذبح کر کے اُنہوں نے اُس کی بوٹیاں کیں اور صحن میں اُسے چولہے پر پکنے کیلئے رکھ دیا۔ صحن کا دروازہ کھلا تھا۔ اُس میں اچانک ایک موٹا تازہ کتا گھر میں داخل ہو کر تیزی سے ہانڈی کی طرف لپکا۔ اُس نے پاؤں کی ٹھوکر سے ہانڈی اُلٹ دی۔ سارا گوشت زمین پر گر گیا۔ کتے نے جلدی جلدی کچھ کھایا جو باقی بچا' اُسے منہ میں دبا کر باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد شیخ چلی جب کھانا پک جانے کا سوچ کر صحن میں آئے تو اُنہوں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ گوشت نام

کی کوئی چیز وہاں موجود نہ تھی۔ ہنڈیا چولہے کے پاس اُلٹی پڑی تھی۔ روتے دھوتے ماں کے پاس پہنچے۔

ماں نے کہا:

"بیٹے! کوئی بات نہیں صبح نئی خرید لینا"

"لیکن اماں! کیسے خریدوں گا' میں نے گدھا بیچ کر یہ چیزیں خریدیں تھیں' اب میں کیا بیچوں گا"

شیخ چلی کی ماں نے جب یہ سنا تو افسوس سے ہاتھ ملنے لگی:

"کاش بیٹے! خدا تجھے کچھ عقل بھی دے دیتا"

شام ہو چکی تھی۔ شیخ چلی اپنے بستر پر لیٹ گئے اور طرح طرح کے خیالی پلاؤ پکاتے ہوئے نیند کی حسین وادیوں میں کھو گئے۔ دوسری صبح جب وہ اُٹھے تو اُنہوں نے بارات لے کر جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

ماں نے پوچھا:

"بیٹا! کہاں چلے؟"...... شیخ چلی کہنے لگے:

"اماں! میں شادی کرنے جا رہا ہوں"

ماں خاموش ہو گئی۔ شیخ چلی نے ٹین کا ایک ڈبہ رسی سے باندھ کر گلے میں لٹکایا۔ ہاتھ میں دو چھڑیاں لیں' برفی کا لفافہ بغل میں دبایا اور گھر سے چل پڑے۔ گھر سے باہر آ کر اُنہوں نے ڈبہ بجانا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ منہ سے شہنائی کی سریلی آواز بھی نکال رہے تھے۔ وہ بڑی مستی کے عالم میں جھومتے ہوئے جا رہے تھے۔ اِسی مستی میں برفی کا لفافہ نہ جانے کب اُن کی بغل سے نیچے گر گیا۔ اب لوگوں کی ایک کثیر تعداد بھی اُن کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ لوگ اُن کی اِس حرکت پر ہنس رہے تھے۔ شیخ چلی صاحب ہر طرف سے بے نیاز چلے جا رہے تھے۔

وہ خیالات میں کچھ ایسے کھوئے ہوئے تھے اور خوشی و مسرت نے اُن پر اِس حد تک غلبہ پا لیا تھا کہ وہ اپنے سے چند گز کے فاصلے پر موجود گڑھ کو نہ دیکھ سکے۔ وہ چونکے تو اُس وقت وہ گہرے گڑھ میں غوطے کھا رہے تھے۔ لوگوں نے فوراً اُنہیں باہر نکالا لیکن شیخ چلی اِس عرصے میں بے ہوش ہو چکے تھے۔ اُنہیں فوراً اُن کے گھر پہنچایا گیا۔

اُن کی ماں اپنے بیٹے کو اِس حال میں دیکھ کر بہت پریشان ہوئی اور اُنہیں ہوش میں لانے کی کوششیں کرنے لگی۔ آخر خدا خدا کر کے اُنہیں ہوش آ ہی گیا۔

"اماں! میں کہاں ہوں؟" اُنہوں نے آنکھیں کھولتے ہی پوچھا۔

"بیٹا! تم اپنے گھر میں ہو"

"میں تو شادی کرنے جا رہا تھا پھر مجھے نہ جانے کیا ہوا؟"...... "بیٹا! تم ایک گہرے گڑ میں گر گئے تھے"

گڑ کا نام سنتے ہی شیخ چلی لرزنے لگے۔

"اماں! اب میں کبھی شادی نہیں کروں گا"

اُنہوں نے بری طرح کانپتے ہوئے کہا۔

"اماں! مجھے کیا معلوم تھا کہ شادی کرنے کیلئے پہلے گڑ میں غسل کرنا پڑتا ہے ورنہ میں کبھی ایسا ارادہ نہ کرتا"

لطائف

مرسلہ: شہزاد ذوالفقار فیصل آباد

استاد (شاگرد سے) "چالباز کسے کہتے ہیں؟"

شاگرد: "جس کی چال میں باز ہو"

☆☆☆☆☆

استاد (شاگرد سے): "دھوکے باز کو جملے میں استعمال کرو"

شاگرد: "جناب! ہم نے دھوکے سے باز پکڑے"

☆☆☆☆☆

سکاؤٹ لڑکیوں کی ابتدائی طبی امداد کے کورس کے دوران یہ سوال دریافت کیا گیا:

"اگر بچہ دروازے کی چابی نگل لے تو تم کیا کرو گی؟"

"میں کھڑکی کے راستے اندر کود جاؤں گی"...... لڑکی نے جواب دیا۔

☆☆☆☆☆

استاد (شاگرد سے) "دواخانہ کسے کہتے ہیں"

شاگرد: "جناب! سر جس کے دو خانے ہوں"

جوتے لنگڑا اور نادان

سید تیمور الحسن

کسی شہر میں ایک نادان تھا — بہت بے مروت وہ انسان تھا
وہ گھر سے نکلتا جو سورج چڑھے — تو کترا کے چلتے تھے چھوٹے بڑے
خیالوں کی دنیا میں رہتا تھا وہ — برا اپنی قسمت کو کہتا تھا وہ
بتاتا تھا دن وہ خرافات میں — حسیں خواب بنتا تھا وہ رات میں
امیروں کی رہتا تھا وہ کھوج میں — تمنا تھی اس کی بھی جیبیں بھریں
چلا ایک دن اپنے یاروں کے پاس — نہ پاؤں میں جوتا نہ تن پہ لباس
کڑی دھوپ تھی پاؤں جلنے لگے — گلے دل میں گھر اس کے کرنے لگے
لگا کرنے شکوے وہ خالق کے ساتھ — کہا، دور ہے میرا دولت سے ہاتھ
خدا نے جہاں پہ عنایات کیں — مگر میرے پاؤں میں جوتا نہیں
وہ جس راہ پر تھا چلا جا رہا — گداگر تھا اس رہ میں بے دست و پا
یکایک گداگر سے ٹکرایا وہ — جو دیکھا اسے سخت گھبرایا وہ
ضمیر اس کا جاگ اٹھا سویا ہوا — وہ اپنے خدا سے یوں گویا ہوا
ملیں مجھ کو جوتے، کہا تھا تجھے — سلامت ہیں پاؤں یہ کافی مجھے
بنایا ہے خالق جو تو نے جہاں — میں ہمت سے لوں رزق اپنا یہاں
تو ارفع ہے، اعلیٰ ہے میرا خدا! — گنہگار ہوں، معاف کر دے خطا
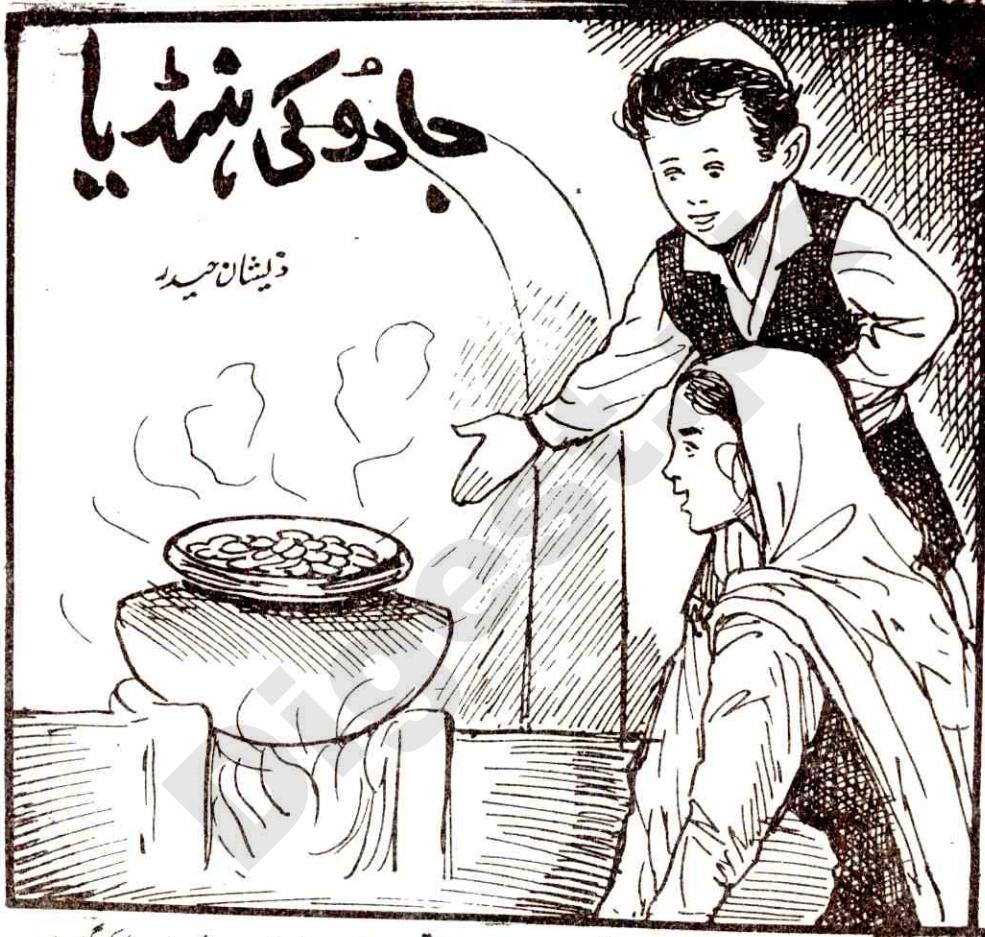
کسی گاؤں میں ایک غریب عورت رہتی تھی۔ اُس کا ایک لڑکا تھا۔ وہ بے چارے بہت غریب تھے۔ لے دے کر اُن کے پاس ایک گائے تھی۔ وہ بہت کم دودھ دیتی تھی۔ دونوں ماں بیٹے بنیئے سے اُدھار لے کر گزر بسر کرتے تھے۔

ایک دن بیٹا عورت کے پاس آیا اور بولا:

"کل شام تک میرے سارے پیسے دے دو ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا"

بیچاری عورت کے پاس پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ وہ بینا کا قرض کیسے ادا کرتی، اُس نے بیٹے سے کہا کہ منڈی جا کر گائے بیچ آؤ، اِس سے جو پیسے ملیں گے وہ بینا کو دے دیں گے۔

لڑکا منڈی کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں ایک بوڑھا ملا۔ بوڑھے کے ہاتھ میں ایک ہنڈیا تھی، اُس نے لڑکے سے پوچھا:

"میاں کہاں جا رہے ہو؟"

لڑکے نے بوڑھے کو ساری بات بتا دی۔ بوڑھے نے کہا:

"پریشان مت ہو، تم مجھے اپنی گائے دے دو۔ اِس کے بدلے میں تمہیں یہ ہنڈیا دے دوں گا"

"میں ہنڈیا لے کر کیا کروں گا؟"

لڑکے نے پوچھا۔

تو بوڑھا بولا:

"یہ ہنڈیا بڑے کام کی ہے۔ اِسے آگ پر رکھنا، پھر جو مانگو گے یہ تمہیں دے دے گی"

لڑکے نے گائے اُسے دے دی اور خود ہنڈیا لے کر گھر آ گیا۔ ماں نے سارا قصہ سنا تو وہ بہت ناراض ہوئی۔ بولی:

"تو بھی کتنا بے وقوف ہے۔ اِس کالی بھدی ہنڈیا کے بدلے اُس بڈھے کو گائے دے دی"

یہ کہہ کر لڑکے کو اُس نے بہت مارا۔ لیکن لڑکے کو بوڑھے کی بات کا اعتبار تھا۔ اُس نے ہنڈیا کو چولہے پر رکھا، جیسے ہی آگ ہنڈیا کے پیندے سے لگی، اُس نے بولنا شروع کر دیا:

"کھی کھی میں جا رہی ہوں"

"تو کہاں جا رہی ہو؟"

لڑکے نے پوچھا۔

"میں بینے کے باورچی خانے میں جا رہی ہوں"

اور یہ کہہ کر ہنڈیا غائب ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہنڈیا پھر آگ پر رکھی ہوئی تھی لیکن اب وہ خالی نہیں تھی۔ اُس میں مزے دار پلاؤ بھرا ہوا تھا۔

ماں بیٹے نے پلیٹیں بھر بھر کے پلاؤ کھایا اور پھر آرام سے لیٹ گئے۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد ماں نے پھر شور مچانا شروع کر دیا۔

"آج کا کھانا تو ہنڈیا نے دے دیا۔ کل کا کیا بنے گا؟"

یہ سن کر ہنڈیا بولی:

"کھی کھی میں جاری ہوں"

"کہاں جاری ہو؟"

لڑکے نے پوچھا۔

"بنیے کے باورچی خانے میں"

یہ کہہ کر وہ غائب ہوگئی۔ چند منٹ بعد وہ واپس آئی تو اُس میں گوشت، ترکاری اور پھل بھرے ہوئے تھے۔ دونوں ماں بیٹوں نے تمام چیزیں نکال کر الماری میں رکھ دیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ماں نے بڑبڑانا شروع کردیا:

"چلو خیر اِس ہنڈیا نے ہمیں ایک ہفتے کے لئے کھانا تو دے دیا ہے لیکن ہم بینا کا قرض کیسے ادا کریں گے؟"

یہ سن کر لڑکے نے ہنڈیا چولہے پر رکھ دی۔ ہنڈیا کو آگ لگی تو وہ بولی:

"کھی کھی! میں جارہی ہوں"

"کہاں جارہی ہو؟"

لڑکے نے پوچھا۔

"بنیئے کی تجوری میں"

اور وہ غائب ہوگئی۔ چند منٹ بعد وہ واپس آئی تو اُس میں ڈھیروں روپے بھرے ہوئے تھے۔ لڑکا اور اُس کی ماں روپے گننے لگے۔ اتنے میں آتش دان کی چمنی میں سے کسی کے چیخنے چلانے کی آواز آئی۔ یہ آواز بنیے کی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا:

"بچاؤ بچاؤ، میں مرا"

اصل میں ہوا یہ تھا کہ جب ہنڈیا بنیے کی تجوری میں گھسی تو بنیے نے اُس کو پیسے چراتے ہوئے دیکھ لیا۔ جب ہنڈیا کھڑکی سے اُڑکر آنے لگی تو بنیے بھاگ کر اُسے پکڑ لیا اور ہنڈیا کے ساتھ اُڑتا ہوا عورت کے گھر تک آگیا۔ ہنڈیا آتش دان کی چمنی میں سے نکل کر گھر کے اندر چلی گئی لیکن بینا بہت موٹا تھا، وہ چمنی میں پھنس کر رہ گیا، لڑکے نے بنیے کو چمنی میں پھنسا ہوا دیکھا تو اُس نے آتش دان میں اور لکڑیاں ڈال دیں۔ دھوئیں سے بنیے کا دم گھٹنے لگا۔ اُس نے چیخنا شروع کیا:

"خدا کیلئے مجھے بچاؤ۔ میں تمہارا سارا قرضہ معاف کرتا ہوں"

عورت بنیے کی مدد کے لئے بھاگی تو لڑکے نے اُسے روکتے ہوئے کہا:

"ماں اِسے مت نکالو"

بنیے نے پھر فریاد کی:

"خدا کیلئے مجھے باہر نکالو۔ میں تمہارا سارا قرضہ معاف کرتا ہوں بلکہ اپنی لڑکی کی شادی بھی تم سے کرتا ہوں"

یہ سن کر لڑکے نے اُوپر چڑھ کر بینیے کو چمنی میں سے گھسیٹ کر باہر نکالا۔ ایک ہفتے بعد بینیے نے اپنی بیٹی کی شادی اُس عورت کے لڑکے سے کر دی۔ اُس نے اپنی ساری دولت لڑکی کو جہیز میں دے دی تھی۔ لیکن آپ ضرور یہ سوچ رہے ہوں گے کہ اس ہنڈیا کا کیا ہوا۔ تو بچو ہنڈیا نے شادی کے دن بڑے اچھے اور مزیدار کھانے پکائے اور پھر غائب ہوگئی۔

حافظ شیرازی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا

☆ عقل مندوں کے نزدیک اپنوں سے وفا نہ کرنے والا دوستی کے قابل نہیں۔

☆ اگر روزی کا انحصار عقل مندی پر ہوتا تو بے وقوفوں سے بڑھ کر کوئی تنگ دست نہ ہوتا۔

☆ علم عمل کے بغیر بیکار ہے۔

☆ ہم غرور کے جامہ میں مست ہیں اور اِس کا نام ہم نے ہوشیاری رکھ لیا ہے۔

☆ کمزور پر رحم کرو گے تو زبردستوں کے ظلم سے بچ جاؤ گے۔

☆ توکل کے آستانہ پر پہنچنا آسان مگر آخرت کی سروری مشکل ہے۔

☆ اللہ کا جو ہو جاتا ہے وہ کسی کا محتاج نہیں ہوتا سوائے اللہ کریم کے۔

☆ اپنے محسنوں کی قدر نہ کرنے والوں سے بڑھ کر کوئی کمینہ نہیں۔

☆ کسی کی مدد کرنا اِس سے کہیں بہتر ہے کہ کسی سے مدد لی جائے۔

☆ حالات دوراں بہترین کتب سے بہتر استاد ہے۔

☆ جو شخص بچپن میں ادب کرنا نہیں سیکھتا بڑی عمر میں اُس سے بھلائی کی کوئی اُمید نہیں۔

☆ حریص آدمی ساری دنیا لے کر بھی بھوکا ہے اور قانع روٹی سے بھی پیٹ بھر سکتا ہے۔

مرسلہ: راؤ جاوید اقبال رینالہ خورد اوکاڑہ

تحریر: ثاقب مسعود

پری کا تحفہ

کسی ملک میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ وہ نہایت انصاف پسند اور بہادر تھا۔ رعایا ہر طرح سے خوش تھی۔ وہ بادشاہ کو دل سے جان سے چاہتی تھی۔ بادشاہ ہر طرح سے خوش تھا لیکن اُسے ایک غم تھا۔ اُس کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ اِس غم میں بوڑھا بادشاہ اور کمزور ہو گیا اور وہ اکثر بیمار رہنے لگا۔

ایک رات بادشاہ نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ اُس سے کہہ رہے ہیں:

"تمہارے ہاں اولاد ہوگی مگر پہلے تم خزانے سے ایک لاکھ روپے غریبوں اور مسکینوں میں بانٹو"

بادشاہ بزرگ کے قدموں میں گر گیا اور اُسی وقت اُس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بہت خوش تھا۔ صبح ہوتے ہی اُس نے وزیر کو بلایا اور کہا کہ خزانے سے ایک لاکھ روپے غریبوں اور مسکینوں میں خیرات کردو۔ وزیر نے حکم کی تعمیل کی اور ایک لاکھ روپے غریبوں میں تقسیم کر دیئے۔

کچھ عرصہ بعد بادشاہ کے ہاں ایک چاند سا بیٹا ہوا۔ کنیز نے آ کر یہ خبر بادشاہ کو سنائی، بادشاہ بہت خوش ہوا اور کنیز کو ایک قیمتی ہار اُتار کر انعام کے طور پر دے دیا اور خود شہزادے کو دیکھنے چلا۔ بادشاہ لڑکے کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اُس کا نام شہزادہ قیصر تجویز کیا۔ اُس دن پورے ملک میں چراغاں کیا گیا۔ یتیموں اور مسکینوں کو کھانا کھلایا گیا۔

جب شہزادہ چار سال کا ہوا تو بادشاہ نے اُس کیلئے استاد مقرر کئے اور شہزادے بہت دل لگا کر پڑھتا اور استادوں کا ادب بھی کرتا۔ استاد شہزادے سے بہت خوش تھے۔ جب شہزادہ بڑھا ہوا تو فنون جنگ میں خوب مہارت حاصل کرلی۔ جب وہ شکار کرنے جاتا تو وہ ڈھیروں جانور وغیرہ مار لاتا تھا۔

ایک روز شہزادہ اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر شکار کھیلنے گیا تو اُس نے کئی جانوروں کا شکار کیا اور اُنہیں بھون کر خود بھی کھایا اور ساتھیوں کو بھی کھلایا۔ کھانے سے فارغ ہوکر سپاہی آرام کرنے کی غرض سے لیٹ گئے۔ اتنے میں شہزادے کو ایک ہرن کا بچہ نظر آیا۔ شہزادہ اُسے زندہ پکڑنا چاہتا تھا۔ اِس لئے گھوڑا اُس کے پیچھے ڈال دیا اور وہ بہت دُور پہاڑیوں میں جا کر غائب ہوگیا۔

شہزادہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ اچانک اُسے پیچھے سے قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ ایک جادوگرنی اُسی ہرن کے بچے کو پکڑ کر لا رہی ہے۔ قریب آ کر جادوگرنی نے شہزادے سے کہا:

"جسے تم ہرن سمجھتے تھے وہ میری بیٹی ہے اور اب میں تمہاری اُس سے شادی کروں گی"

یہ کہہ کر جادوگرنی نے شہزادے کو لے جا کر ایک جگہ قید کردیا، وہاں ایک خوبصورت لڑکی بھی قید تھی۔ شہزادے نے اپنی کہانی اُسے سنائی اور اُسے یہ بھی بتا دیا کہ جادوگرنی میری شادی اپنی لڑکی سے کرنا چاہتی ہے۔ لڑکی نے کہا:

"میرا نام انجم آراء ہے اور میں ملک یونان کی

شہزادی ہوں اور یہ جادوگرنی میری ایک خاص سہیلی کے روپ میں آئی اور مجھے باتوں باتوں میں محل سے بہت دور لے گئی اور ایک جنگل میں لے جاکر کبوتر بنادیا اور پھر مجھے قید کردیا اور اب وہ میری شادی اپنے لڑکے سے کرنا چاہتی ہے۔ اُس کا لڑکا اور لڑکی بالکل کالے اور ایک ایک آنکھ سے کانے ہیں۔ اب وہ مجھ سے پوچھنے آئے گی"

اِسی دوران میں جادوگرنی آگئی اور شہزادی سے پوچھا:...... "تم میرے لڑکے سے شادی کروگی؟"

شہزادی نے صاف انکار کردیا۔ اب جادوگرنی غصہ میں آگئی اور شہزادی کو کبوتر بنادیا اور شہزادے سے کہا کہ:

"کل تم سے پوچھوں گی، اگر تم نے انکار کیا تو تمہارا بھی وہی حشر ہوگا جو شہزادی کا ہوگا ہے"

یہ کہہ کر جادوگرنی چلی گئی۔ اب شہزادہ سوچنے لگا کہ یہاں سے کیسے نجات حاصل کرے۔ اتنے میں اُسے نیند آگئی اور اُس نے خواب میں دیکھا کہ ایک پری اُس کو کہہ رہی ہے کہ:

"یہ طلسمی تلوار لو، اِس سے تم جادوگرنی کو مارنے میں کامیاب ہوجاؤ گے" اور پری نے یہ بھی بتایا کہ "جادوگرنی کی جان فلاں کبوتر میں ہے اور تم اُس کو مار کر آزاد ہوسکتے ہو"

اسی دوران شہزادے کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے دیکھا کہ واقعی اُس کے قریب طلسمی تلوار پڑی ہے۔ شہزادے نے تلوار اُٹھالی۔ اِسی دوران جادوگرنی آگئی۔ اُس نے کہا:

"تم میری بیٹی سے شادی کروگے یا نہیں؟"

شہزادے نے کہا:

"پہلے تم مجھے باہر نکالو۔ پھر تمہارے سوال کا جواب دوں گا"

جادوگرنی نے شہزادے کو باہر نکالا۔ شہزادے نے باہر نکلتے ہی جادوگرنی پر وار کیا جس کا جادوگرنی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جادوگرنی کو بہت غصہ آیا اور اُس کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی ایک تلوار آگئی۔ دونوں بہت دیر تک لڑتے رہے لیکن کوئی بھی زیر نہ ہوا۔ شہزادہ لڑتا ہوا سوچ رہا تھا کہ کس کبوتر پر وار کرے۔ اِسی دوران شہزادی جو کبوتر بنی ہوئی تھی، بولی کہ دائیں طرف کے کبوتر پر وار کرو"

اور پھر شہزادے نے ایک بھرپور وار کیا اور کبوتر کا کام تمام کردیا۔ کبوتر کا مرنا تھا کہ جادوگرنی بھی مرگئی۔ اُس کے مرتے ہی شہزادی بھی اپنی اصلی صورت میں آگئی۔ اب شہزادہ شہزادی کو لے کر اپنے ملک پہنچا تو

اُسے معلوم ہوا کہ وزیر نے غداری کر کے بادشاہ کو اور ملکہ کو قید کر دیا ہے۔ وہ سیدھا شہزادی کو لے کر یونان پہنچا۔ بادشاہ شہزادی کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور جب شہزادی نے اپنے باپ کو شہزادے کے متعلق بتایا تو وہ اور بھی خوش ہوا۔ لیکن یہ سُن کر کہ شہزادے کے ملک پر اُس کے وزیر نے غداری کر کے قبضہ کرلیا ہے تو اُسے بہت غصہ آیا۔ اُس نے فوراً فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ شہزادہ شاہی فوج لے کر اپنے ملک پہنچا اور اپنے ایک سپاہی سے یہ کہہ کر بھیجا کہ جاؤ وزیر سے کہہ دو، شہزادہ اپنا ملک حاصل کرنے کیلئے آ گیا ہے۔ شہزادے کے حکم سے سپاہی جب وزیر کے دربار میں پہنچا اور شہزادے کی آمد کا بتایا تو وزیر سن کر آگ بگولہ ہوگیا۔ اُس نے فوراً ہی شہزادے سے مقابلے کا اعلان کر دیا۔ وزیر جب فوج لے کر میدان جنگ میں پہنچا تو ساری فوج اپنے نیک دل اور بہادر شہزادے کو دیکھ کر اُس سے مل گئی۔ یہ دیکھ کر وزیر نے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن اپنے سپاہیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اب شہزادہ فتح کے ڈنکے بجاتا ہوا شہر میں داخل ہوا۔ یہاں آتے ہی اُس نے اپنے ماں باپ کو قید خانے سے نکال اور دوبارہ تخت پر بٹھایا۔ بادشاہ اور ملکہ اپنے بیٹے سے تمام حالات سن کر بہت خوش ہوئے۔ شہزادے کی شادی شہزدی سے ہوگئی اور بادشاہ نے شہزادے کو تاج وتخت سونپ دیا۔

قائداعظم محمد علیؒ نے فرمایا

☆ ہر قسم کی احتیاج کو پورا کرنے اور ہر طرح کے خوف کو دُور کرنا ہی ہمارا مقصد نہیں ہونا چاہیے بلکہ وہ آزادی اور اُخوت اور مساوات کو بھی حاصل کرنا چاہیے جس کی تعلیم اسلام نے ہمیں دی ہے۔

☆ آج کل کی جنگ سرحدوں کی قید سے آزاد ہے۔ اِس لئے اِس کا مقابلہ کرنے کیلئے ذہنی و دفاع تیاریوں دونوں سے کرنا چاہیے۔

☆ آپ ہمت نہ ہاریں اور بہتری کی اُمید رکھیں، آپ نوجوان ہیں، آپ کو محنت، محنت اور مسلسل محنت کرنا ہوگی۔

☆ انسان کی کامیاب زندگی میں ناکام لمحے بھی ضرور آتے ہیں۔

مرسلہ: زاہد حسین شیخوپورہ

نٹ کھٹ خرگوش

تحریر: ناہید انجم

ایک بڑھیا تھی۔ یہ بڑھیا شہر میں رہتی تھی۔ وہ ہر روز شہر کے قریبی جنگل میں جاتی اور پھل توڑ کر انہیں شہر لے جا کر فروخت کر دیتی۔

جنگل میں ایک خرگوش بھی رہتا تھا۔ اُسے شہر دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ ایک دن اُس نے اپنے سردار یعنی مالک سے شہر جانے کی اجازت مانگی۔

بڑھیا ہر شام کو جنگل میں آتی اور پھل توڑ کر لے جاتی۔ایک شام جب وہ پھل توڑ رہی تھی کہ خرگوش اُس کے قریب گیا۔اُس نے جب بہت سارے پھل بڑھیا کی ٹوکری میں دیکھے تو اُس سے پوچھا:

''بی اماں! اتنے ڈھیر سارے پھلوں کا آپ کیا کریں گی؟''

خرگوش کا یہ سوال سن کر بڑھیا بولی:

''میں انہیں شہر لے جاؤں گی''

بڑھیا سے شہر کا سُن کر خرگوش اُچھل پڑا۔اُس کا خیال تھا کہ بڑھیا جنگل میں ہی رہتی ہے جو ہر روز پھل توڑ کر لے جاتی ہے لیکن جب اُسے پتہ چلا کہ بڑھیا کا گھر شہر میں ہے تو وہ بڑا خوش ہوا۔اب وہ ہر شام بڑھیا سے ملنے لگا۔

خرگوش کو شہر دیکھنے کا بہت جنون تھا۔بڑھیا سے جب بھی اُس کی ملاقات ہوتی تو وہ اُس سے شہر کے بارے ضرور باتیں کرتا۔خرگوش کی اب بڑھیا سے کافی دوستی ہو چکی تھی۔بڑھیا جب پھل توڑنے لگتی تو خرگوش بھی اُس کی مدد کرتا۔یوں معمول سے زیادہ پھل بڑھیا کو ملنے لگے۔

ایک دن خرگوش نے بڑھیا سے پوچھا:

''کیا آپ مجھے اپنے ساتھ شہر نہیں لے جاسکتیں؟''

خرگوش کا سوال بڑھیا کو اچھا نہ لگا لیکن جب خرگوش نے شہر جانے کیلئے بہت اصرار کیا تو وہ کہنے لگی:

''نہیں میں تمہیں شہر نہیں لے کر جاؤں گی''

بڑھیا کا جواب سُن کر خرگوش خاموش رہا۔جنگل کے سردار سے خرگوش نے ایک بار پھر شہر جانے کی اجازت مانگی مگر سردار نے اُس کو اجازت نہ دی۔خرگوش نے اِس کی وجہ جاننی چاہی تو وہ کہنے لگا:

''تمہارا شہر جانا ٹھیک نہیں''

''وہ کیسے؟''

خرگوش نے سردار سے پوچھا تو اُس سردار نے خرگوش کو بتایا:

''شہر میں تمہیں کوئی پکڑ کر کھا جائے گا''

''میں اُن کے قریب نہیں جاؤں گا اور نہ ہی کوئی مجھے پکڑ سکے گا''

خرگوش نے سردار کی بات سُن کر اُس کے جواب میں کہا تو اِس پر سردار نے کہا:

''بیٹا خرگوش! تم اکیلے شہر کیسے جاؤ گے؟''

یہ سُن کر خرگوش نے سردار سے کہا:

"آپ ہی میرے ساتھ چلیں"

"نہیں! میں ایسا نہیں کرسکتا"

سردار نے غراتے ہوئے خرگوش کو جواب دیا۔ سردار کا موڈ آف دیکھ کر خرگوش نے تحمل سے کام لیا اور اپنے شہر جانے کی ضد جاری رکھی۔ نہ ہی وہ خود اُس کے ہمراہ شہر جانے پر آمادہ ہوا۔ تب خرگوش نے اکیلے ہی شہر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اُدھر سردار نے بھی اُسے اِس شرط پر شہر جانے کی اجازت دے دی کہ اگر اُسے کسی نے پکڑلیا تو کوئی بھی اُس کی مدد کیلئے شہر نہیں آئے گا۔ اب خرگوش کیلئے مسئلہ شہر کو اکیلے جانے کا تھا۔ اِس کا ذکر اُس نے بڑھیا سے کیا تو وہ بولی:

"نہیں بیٹا! تم میرے ساتھ شہر نہیں جاسکتے"

خرگوش جب بھی بڑھیا سے شہر جانے کی درخواست کرتا تو بڑھیا اُسے اپنے ساتھ لے جانے سے انکار کردیتی۔ اُس کا خیال تھا کہ خرگوش شہر جا کر اُسے تنگ کرے گا۔

خرگوش نے جب دیکھا کہ بڑھیا کسی بھی صورت میں اُسے شہر لے جانے کیلئے تیار نہیں تو اُس کے ذہن میں ایک ترکیب سوجھی کہ وہ کسی دن بڑھیا کی ٹوکری میں چھپ کر بیٹھ جائے گا۔

اگلی شام بڑھیا پھل توڑنے جنگل میں آئی۔ اس نے پھل توڑے اور اُنہیں ٹوکری میں رکھنے لگی۔ ٹوکری بڑھیا کی پشت کی جانب تھی۔ خرگوش چپکے سے اُس میں گھس کر بیٹھ گیا جس کی بڑھیا کو قطعاً خبر نہ ہوئی۔ گھر پہنچ کر جیسے ہی ٹوکری زمین پر رکھی، خرگوش اُس میں سے پھدک کر باہر نکل پڑا اور بڑھیا کے گھر میں گھومنے لگا۔

بڑھیا کے بچے خرگوش کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے لیکن بڑھیا کو بہت حیرت تھی کہ خرگوش کب اور کیسے اُس کی ٹوکری میں آن گھسا۔ بچوں نے ٹوکری سے پھل نکال کر خرگوش کے آگے رکھ دیا۔ خرگوش بھوکا تھا، وہ بڑے مزے سے وہ پھل کھانے لگا۔ تب بڑھیا جنگل سے پھل توڑنے جاتی تو خرگوش شہر کی سیر کو نکل جاتا۔ اُسے جنگل کی نسبت شہر کی زندگی بہت اچھی لگی۔ ابھی شہر آئے اُسے دو تین دن ہوئے تھے کہ اُس نے فیصلہ کرلیا کہ اب وہ جنگل واپس نہیں جائے گا۔

شہر میں خرگوش کی آمد سے بڑھیا کو بہت نقصان ہوا۔ وہ ہر روز بڑھیا کے پھل کھانے لگا جس سے بڑھیا کی آمدنی میں کمی ہونے لگی۔ اب وہ خرگوش کو کسی صورت میں اپنے گھر میں رکھنے کے لیے تیار نہ تھی لیکن وہ بڑھیا کے ہاں رہنے پر بضد تھا۔ اُس کی یہ ضد دیکھ کر بڑھیا اب

اِس شرط پر ساتھ رکھنے پر آمادہ تھی کہ وہ ہر شام اُس کے ہمراہ جنگل جایا کرے اور پھل توڑنے میں اُس کی مدد کیا کرے گا۔

یہ شرط خرگوش کیلئے ناقابل قبول تھی لیکن اُس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اِس کو مان لیا۔ دن کے وقت وہ شہر کی سیر کرتا اور شام کو بڑھیا کے ہمراہ جنگل چلا جاتا۔ اب بڑھیا کو پہلے کی نسبت زیادہ پھل ملنے لگے۔

اُدھر سردار کو جب پتہ چلا کہ خرگوش جنگل میں آتا ہے لیکن رات کو قیام نہیں کرتا تو اِس کی وجہ جاننے کیلئے اُس نے خرگوش کو اپنے ہاں طلب کیا۔

خرگوش گھر آیا تو بڑھیا بھی اُس کے ہمراہ تھی۔ سردار کو یہ بھی دکھ تھا کہ جنگل کے تمام پھل بڑھیا اور خرگوش توڑ کر شہر لے جاتے ہیں۔ اُس نے بڑھیا سے پوچھا:

"تم یہ پھل کیوں توڑتی ہو؟"

"یہ پھل میرا ذریعہ معاش ہیں اور اِن کے توڑنے میں خرگوش میری مدد کرتا ہے"

بڑھیا کی بات جان کر سردار نے اُس سے کہا:

"آئندہ تم جنگل سے پھل مت توڑنا۔ ہاں آئندہ یہ خرگوش جنگل میں ہی رہے گا"

"ایسا نہیں ہوسکتا"

بڑھیا کی بجائے خرگوش نے جواب دیا۔

آئندہ سے بڑھیا کے پھل نہ توڑنے پر سردار اور خرگوش کی خوب تکرار ہوئی جس کی نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ سردار نے بڑھیا کا داخلہ بھی جنگل میں ممنوع قرار دے دیا۔

سردار کا یہ فیصلہ خرگوش کو بہت ہی ناگوار گزرا۔ بڑھیا کے ہمراہ وہ بھی جنگل سے نکل آیا اور آتے آتے سردار سے کہنے لگا:

"تم بہت کمینے ہو جس نے میری ماں کو روزگار سے محروم کردیا ہے"

اُدھر سردار نے خرگوش کو شہر جانے سے روکا لیکن خرگوش باغی ہوچکا تھا۔ اُس نے سردار کی بت نہ ماننی تھی نہ مانی۔

"ٹھیک ہے اگر تم شہر چلے گئے تو آئندہ تم جنگل میں نہیں آؤ گے"

خرگوش سے سردار حاکمانہ لہجے میں بولا:

"ٹھیک ہے، آئندہ میں کبھی بھی یہاں نہیں آؤں گا"

بڑھیا اب کسی اور جنگل سے پھل توڑ کر لاتی اور شہر

میں اِسے فروخت کر دیتی۔

خرگوش کے شہر میں خوب مزے تھے۔ بڑھیا کے بچے اُس سے کھیلتے اور اُس کو پھل کھلاتے ، خرگوش شہر میں رہ کر بہت خوش تھا۔ اُسے کبھی بھی سردار یا جنگل کے باسیوں کی یاد نہ آئی۔

اُدھر سردار کا خیال تھا کہ خرگوش جلد واپس آجائے گا مگر ایسا نہ تھا کیونکہ وہ باغی ہو چکا تھا، اب اُسے شہر میں ہی رہنا تھا۔

ایک رات خرگوش سیر کرنے کیلئے جا رہا تھا کہ راستے میں مانو بلی سے اُس کی ملاقات ہوگئی۔ جنگلی خرگوش کو دیکھ کر اُس نے پوچھا:

"بھائی خرگوش! تم یہاں کیسے؟"

"بہن! میں شہر میں آگیا ہوں اور یہاں ہی رہتا ہوں"

"اچھا!"

بلی نے اُس کو لالچی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر کہنے لگی:

"آؤ نا کسی دن میرے گھر"

"نہیں بہن! میری بڑھیا ناراض ہو جائے گی"

خرگوش نے مانو کی بات سُن کر کہا۔

"تمہاری بڑھیا کہاں رہتی ہے؟"

خرگوش کی بات سُن کر بلی نے پوچھا تو خرگوش نے اُسے بتایا کہ بڑ کے درخت کے ساتھ ہمارا گھر ہے"

"درخت کے قریب۔ وہاں تو میرا بھی گھر ہے"

بلی نے خرگوش کو بتایا۔ تب خرگوش کو بہت خوشی ہوئی کہ باتیں کرنے اور کچھ کہنے کیلئے مانو بلی کا ساتھ ہو گیا ہے۔ دونوں میں دن بدن دوستی بڑھنے لگی۔ اب بلی تاک میں رہنے لگی کہ اُسے کب موقع ملے اور وہ خرگوش کو لقمہ بنا لے۔ خرگوش کو قطعی گمان نہ تھا کہ بلی اُس کو کھانے کی تاک میں رہتی ہے۔ وہ جب بھی خرگوش سے ملتی، بڑے پیار کا اظہار کرتی۔

بڑھیا نے مانو بلی سے دوستی سے منع کیا لیکن خرگوش نے اُس کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور مانو بلی سے دوستی کی پینگیں بڑھاتا رہا۔ ایک رات موقع پاتے ہی اُس نے خرگوش کو دبوچ لیا اور خوب مزہ لے کر کھایا اور یوں خرگوش کو بڑھیا اور سردار کا کہنا نہ ماننے کی سزا مل گئی۔

شہزادی حسینہ

تحریر: مقصود ایاز

ایک بادشاہ کی تین بیٹیاں تھیں۔ بڑی دو شہزادیاں بدصورت اور بدمزاج تھیں لیکن سب سے چھوٹی اِس قدر خوبصورت اور پیاری تھی کہ سب لوگ اُسے حسینہ کہا کرتے تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ بادشاہ کے مکار وزیر نے دھوکے سے شاہی تخت و تاج پر قبضہ کرلیا۔ بیچارے بادشاہ کو بڑی مشکل سے جان بچا کر اپنی تینوں شہزادیوں کے ساتھ شاہی محل سے بھاگنا پڑا اور بہت دُور ایک جنگل میں جا کر جھونپڑی بنا کر رہنا پڑا۔ غربت کی وجہ سے وہ

کوئی نوکر بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ دونوں بڑی شہزادیاں بڑی کاہل اور کام چور تھیں۔ وہ دن بھر آرام سے لیٹی رہتیں، بیچاری چھوٹی شہزادی کو دن بھر تمام کام کرنے پڑتے تھے۔

ایک دن بادشاہ کو خواب میں ایک بزرگ نے بتایا کہ اگر وہ یہاں سے چند میل دُور جائے تو اُس کے اچھے دن پھر لوٹ سکتے ہیں۔ بادشاہ یہ خواب دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اگلے دن اُس نے اپنی بیٹیوں کو سینے سے لگایا اور سفر کی تیاری کرنے لگا۔ چلتے وقت اُس نے شہزادی حسینہ سے دریافت کیا کہ وہ اُس کیلئے کیا لائے۔ بڑی شہزادیوں نے چلا کر کہا:

"ابا جان! ہمارے لئے اچھے اچھے زیور اور کپڑے لائیے گا"

بادشاہ نے کہا:

"دیکھو! اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو ضرور تمہاری خواہشات کے مطابق کپڑے اور زیور لاؤں گا"...... اتنا کہہ کر بادشاہ نے شہزادی حسینہ سے پوچھا:

"بیٹی! تم بھی تو کہو کہ تمہارے لئے کیا لاؤں؟"

شہزادی حسینہ نے یہ سوچ کر کہ اب باپ کی پہلے جیسی حالت نہیں کہ وہ قیمتی تحائف لا سکے' اُس نے کہا:

"ابا جان! آپ میرے لئے ایک خوبصورت سا گلاب ہی لیتے آیئے گا"......

بادشاہ یہ سن کر سفر پر روانہ ہو گیا۔ دن بھر سفر کرنے کے بعد وہ ایک سنسان جنگل میں پہنچا۔ دفعتاً اُسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ راستہ بھول گیا ہے۔ یہ سوچ کر وہ بہت پریشان ہوا۔ مایوسی اور نا اُمیدی نے اُسے گھیر لیا۔ ایسے سنسان جنگل میں اُسے راستہ کون بتائے گا۔ ابھی وہ وہاں کھڑا کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک خطرناک طوفان اُٹھا۔ وہ گھبرا کر ایک درخت پر چڑھ گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ شاید روشنی کی کوئی کرن نظر آ جائے۔ دفعتہً اُسے دُور بہت دُور روشنی سی دکھائی دی۔ وہ تیزی سے درخت سے نیچے اُترا۔ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر روشنی کی سمت چل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک شاندار قلعے کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ بہت خوش ہوا اور کسی ایسے آدمی کا انتظار کرنے لگا جو اُسے قلعے کے اندر لے جا سکے۔ جب کافی دیر ہو گئی تو وہ گھوڑے سے نیچے اُترا اور اندر جا کر اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ بادشاہ کو وہاں کوئی انسان نظر نہ آیا۔ وہ بہت حیران تھا کہ اتنا بڑا قلعہ آرام اور آرائش کی ہر چیز موجود تھی مگر رہنے والا کوئی نہیں۔

آخر میں بادشاہ ایک بڑے کمرے میں پہنچا جو

روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ وہاں دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ بادشاہ نے خوب سیر ہو کر لذیذ اور مرغن کھانے کھائے۔ کھانے کے بعد اُسے نیند آنے لگی۔ وہ ایک سونے کے کمرے میں جا کر بستر پر سو گیا۔ اُس کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب اُس نے صبح کو اپنے پرانے کپڑوں کی بجائے نئے کپڑے دیکھے۔ اُسے یہ بات بڑی عجیب سی معلوم ہوئی۔ اُس نے ناشتہ کیا اور پھر باغ میں بڑے خوبصورت گلاب دیکھ کر اُسے شہزادی حسینہ کی گلاب والی فرمائش یاد آ گئی۔ اُس نے جلدی سے ہاتھ بڑھایا اور ایک خوبصورت گلاب توڑ لیا۔ اچانک اُس نے ایک کرخت آواز سنی، مڑ کر دیکھا تو ایک نہایت بدشکل اور عجیب وغریب انسان کھڑا تھا۔ اگرچہ اُس کا جسم آدمی جیسا تھا لیکن اُس کا چہرہ کسی جانور جیسا تھا۔ بادشاہ اُسے دیکھ کر خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔

انسان نما جانور نے کہا:

"احسان فراموش انسان! کیا میں نے تجھے کھانا نہیں کھلایا اور رات بھر پناہ نہیں دی اور اِس کا بدلہ تم اِس طرح دیتے ہو کہ میرے پھول کو لئے جاتے ہو۔ میں تمہیں اِس کی سخت سزا دوں گا۔ جاؤ تم ایک دن کے اندر اندر مر جاؤ گے"

بادشاہ یہ سُن کر بہت گھبرایا۔ اُس نے کہا:

"جناب! مجھ سے بھول ہو گئی، آپ مجھے معاف کر دیں۔ اگر میں آپ سے پہلے ملاقات کر لیتا تو یقیناً یہ نوبت نہ آتی"

آخر اُس وحشی جانور نے اِس شرط پر بادشاہ کو چھوڑا کہ وہ گھر جا کر اُس چیز کو یہاں بھیجے جس پر اُسکی نظر سب سے پہلے پڑے گی۔ بادشاہ نے سوچا کہ جب وہ گھر جائے گا تو سب سے پہلے اُس کی نگاہ اپنے کتے پر پڑے گی۔ چنانچہ اُس نے وحشی انسان کی بات کو منظور کر لیا۔ لیکن اُس کی پریشانی کی حد نہ رہی جب اُس کی نگاہ سب سے پہلے شہزادی حسینہ پر پڑی۔ وہ یہ کہتی ہوئی دوڑی:

"ابا جان، آہا کتنا اچھا پھول ہے"

بادشاہ نے مغموم ہو کر کہا:

"تمہیں نہیں معلوم بیٹی! اِس پھول کی مجھے کتنی بڑی قیمت ادا کرنا پڑے گی"

بادشاہ نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ شہزادی حسینہ نے یہ سن کر کہا:

"ابا جان! آپ میری فکر نہ کریں۔ اپنا وعدہ پورا کریں"

دوسرے دن بادشاہ شہزادی حسینہ کو اُس پُراسرار قلعے میں لے گیا۔ کھانے کے کمرے میں طرح طرح کے لذیذ کھانے رکھے تھے۔ دونوں نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ خاموش بیٹھے کچھ سوچ ہی رہے تھے کہ وہ وحشی جانور وہاں پہنچ گیا۔ اُس نے ایک نظر شہزادی حسینہ کو دیکھا اور شہزادی نے بھی اُسے دیکھا۔ ایک لمحہ کیلئے تو وہ لرز اُٹھی۔ وہ سوچنے لگی کہ کتنا بدشکل انسان ہے لیکن وحشی انسان اُسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے بادشاہ سے کہا کہ وہ اُسے وہاں چھوڑ جائے۔ بادشاہ مجبوراً چلا گیا۔

بادشاہ کے جانے کے بعد وحشی انسان نے شہزادی کو اُس کا کمرہ دکھایا۔ شہزادی حسینہ وہاں جا کر سو گئی۔ خواب میں اُس نے دیکھا کہ ایک پری اُس سے کہہ رہی تھی کہ شہزادی حسینہ ڈرو نہیں، یہ وحشی جانور اصل میں ایک شہزادہ ہے۔ ایک جادوگرنی نے اِس کی یہ حالت بنا دی ہے۔ اگر تم اِس سے شادی کر لو تو وہ اصلی روپ میں واپس آ سکتا ہے۔"

شہزادی حسینہ یہ سن کر بہت خوش ہوئی۔ دوسرے دن جب وحشی انسان نے شہزادی سے شادی کی درخواست کی تو شہزادی انکار نہ کر سکی۔ شادی کی حامی بھرتے ہی وحشی انسان میں تعجب خیز تبدیلی رونما ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک خوبرو شہزادہ بن گیا۔ شہزادی حسینہ کو اتنا تعجب ہوا کہ اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ تب شہزادے نے بتایا کہ ایک مکار جادوگرنی مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ میرے انکار پر اُس نے مجھے ایک بدشکل جانور بنا دیا۔ چلتے وقت اُس نے کہا کہ میرے جادو کا اثر اُس وقت زائل ہو گا جب کوئی حسین لڑکی مجھ سے شادی کرنے کیلئے تیار ہو گی اور یوں میں اب اپنی اصلی حالت میں آ گیا ہوں"

شہزادہ وہاں سے سیدھا شہزادی حسینہ کے باپ بادشاہ کے پاس گیا اور اُسے اور اُس کی دونوں بیٹیوں کو لے کر قلعہ میں واپس آیا۔ بادشاہ اپنی پیاری بیٹی سے دوبارہ مل کر بہت خوش ہوا۔ سب کو قلعے میں چھوڑ کر شہزادہ اپنے باپ کے پاس گیا۔ اُسکے ماں باپ اُسے زندہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ شہزادے نے ساری کہانی اُنہیں سنائی۔ حسینہ کے باپ کی پوری داستان تو وہ سن ہی چکا تھا۔ قلعہ میں واپس جانے سے پہلے ہی اُس نے اپنی فوج کے ساتھ ایک بھرپور حملہ کیا اور مکار وزیر کا خاتمہ کر کے سلطنت کی باگ دوڑ خود سنبھال لی۔ رعایا مکار وزیر کے مظالم سے بہت تنگ تھی۔ شہزادے کی آمد پر لوگوں نے

سکھ کا سانس لیا۔ جب اُنہیں اِس بات کا علم ہوا کہ اُن کا پیارا بادشاہ اور اُس کی تینوں بیٹیاں ابھی تک زندہ ہیں اور وہ جلد ہی وطن واپس لوٹ رہے ہیں تو پورے ملک میں ایک شاندار جشن منایا گیا۔ اگلے دن بادشاہ اور شہزادیاں بڑی شان وشوکت کے ساتھ واپس ملک پہنچیں۔

دوسری طرف شہزادہ اپنے ملک سے ایک عالیشان بارات لے کر اُن کے ملک آیا اور پھر بڑی دھوم دھام سے شہزادی حسینہ کی شادی شاہی محل میں شہزادے سے ہوگئی۔ شادی کی تقریب اِس قدر شاندار تھی کہ سب نے اُس کی بے حد تعریف کی اور پھر وہ سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔

مسکرانا منع ہے

مرسلہ: راشد حسین جعفری، لاہور

ایک صاحب سفر سے گھر پہنچے تو بیوی نے خیریت معلوم کرنے کے بعد پوچھا:

"آپ کا سفر کیسا رہا؟"......اُن صاحب نے بتایا:

"بڑی تکلیف رہی کیونکہ ریل میں اُوپر والی برتھ ملی تھی اور رات بھر پیٹ کی خرابی کی وجہ سے رفع حاجت کیلئے نیچے اُترنا پڑتا تھا"

بیوی نے کہا: "اتنی ہی تکلیف تھی تو نیچے کی برتھ والے مسافر سے درخواست کر کے جگہ ہی بدل لیتے"

وہ صاحب بولے:

"خیال تو مجھے بھی آیا تھا لیکن نیچے والی برتھ پر کوئی تھا ہی نہیں"

☆☆☆☆☆☆

ایک کنجوس آدمی نے اپنے بچوں سے کہا: "تم میں سے جو بچہ رات کو کھانا نہیں کھائے گا اُسے ایک روپیہ ملے گا"

سب بچوں نے ایک ایک روپیہ لیا اور بھوکے ہی سو گئے۔ صبح اُٹھے تو بھوک نے شدید بے چین کر رکھا تھا۔ اُنہوں نے باپ سے ناشتے کا کہا تو وہ بولا:

"جو ایک روپیہ ادا کرے گا' ناشتہ صرف اُسی بچے کو ملے گا"

پھولوں کی شہزادی

بہت پرانی بات ہے کہ کسی ملک میں ایک راجہ اور رانی رہتے تھے۔ اُن کے ہاں اولاد نہ تھی۔ دونوں ہر روز دُعا مانگتے کہ اے خدا! ہمارے ہاں بھی اولاد دے مگر اُن کی یہ آرزو پوری نہیں ہو رہی تھی۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ رانی تالاب میں نہا رہی تھی تو ایک مینڈک پانی سے باہر نکلا اور بولا:

"رانی صاحبہ! آپ کی اولاد کی تمنا جلد ہی پوری ہو جائے گی۔ اب سے ایک سال بعد آپ کے ہاں ایک

لڑکی پیدا ہوگی"......

اتنا کہہ کر مینڈک نے چھلانگ لگائی اور پانی کے اندر غائب ہوگیا۔

خدا کی شان کہ مینڈک کی بات صحیح ہی نکلی۔ پورے ایک سال بعد رانی کے ہاں ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی پیدا ہوئی۔ راجہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اِسی خوشی میں اُس نے ایک بہت بڑی دعوت کا انتظام کیا جس میں اُس کے عزیز و رشتے دار، دوست احباب اور رعایا میں سے چیدہ چیدہ آدمیوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

اِس شہر میں تیرہ ایسی عورتیں رہتی تھیں جو فقیرنیوں کے بھیس میں رہتی تھیں لیکن وہ دراصل جادوگرنیاں تھیں۔ جو اُن کے منہ سے نکل جاتا تھا وہ پورا ہو کر ہی رہتا تھا۔ بچوں کی پیدائش پر لوگ اُنہیں بلا کر اُن کی دعوت کرتے اور اُن کی دُعائیں لیتے تھے۔

راجہ بلانا تو سب کو ہی چاہتا تھا لیکن اُس کے پاس سونے کی صرف بارہ تھالیاں تھیں۔ اِس لئے اُس نے اِن تیرہ عورتوں میں سے بارہ کو بلوا بھیجا اور ایک کو رہنے دیا۔ جب دعوت ختم ہوگئی تو وہ عورتیں شہزادی کو دُعائیں دینے لگیں۔ کسی نے شہزادی کی سلامتی کی دُعا کی، کسی نے اُس کی صحت و تندرستی کیلئے دُعا مانگی، کسی نے شہزادی کی خوبصورتی کی تو کسی نے اُس کی امیری اور دولت مندی کیلئے دُعا کی۔

ابھی بارہویں عورت شہزادی کو دُعا دینے کیلئے کھڑی ہوئی ہی تھی کہ نہ جانے کہاں سے وہ تیرھویں عورت بھی وہاں آن پہنچی جسے راجہ نے دعوت میں نہیں بلایا تھا۔ غصے کے مارے اُس کا چہرہ سرخ تھا...... جیسے راجہ نے دعوت میں نہ بلا کر اُس کی توہین کی تھی اور اب وہ اپنی اِسی توہین کا بدلہ لینے یہاں آئی تھی اور کسی شخص کی کوئی بات سننے بغیر ہی اُس نے شہزادی کو بددُعا دی کہ چودہ برس کی عمر میں اچانک چرخے کی ہلکی سی چوٹ کے سبب شہزادی کی موت واقع ہو جائے گی۔ وہ عورت یہ کہہ کر شاہی دربار سے باہر نکل گئی۔ درباریوں کے چہرے خوف سے ماند پڑ گئے۔

بارھویں عورت نے ابھی تک شہزادی کے حق میں دُعا نہیں کی تھی۔ اُس میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ تیرھویں عورت کی دی ہوئی بددُعا کو کاٹ سکے۔ پھر بھی اُس نے بددُعا کے اثر کو کم کرنے کیلئے اتنا کہا:

"شہزادی کی یہ موت اصلی موت نہ ہوگی بلکہ وہ ایک سو سال کی گہری نیند کے بعد پھر اُٹھ کھڑی ہوگی"

فقیرنی کی بددُعا پر راجہ نے حکم جاری کر دیا کہ اِس

ملک میں جتنے بھی چرخے ہیں اُن سب کو جلا دیا جائے' جس کے گھر میں چرخہ تھا' اُس نے راجہ کے حکم کی تعمیل میں سب چرخے جلا ڈالے۔

جادوگر عورتوں نے شہزادی کو جو دُعائیں دی تھیں' وہ اب اثر لائیں۔ شہزادی روز بروز خوبصورت ہوتی جا رہی تھی' بیماری اُس کے پاس بھی پھٹکتی نہیں تھی۔ جو بھی شہزادی کو دیکھتا' اُسے پیار کیے بغیر نہ رہتا تھا۔

جس روز شہزادی چودہ برس کی ہوئی تو اُس روز راجہ اپنی رانی کے ساتھ مندر میں پوجا کرنے کیلئے گیا ہوا تھا۔ شہزادی محل میں اکیلی تھی۔ اکیلے میں شہزادی کا جی گھبرانے لگا۔ وہ محل میں اِدھر اُدھر گھومتی ہوئی کبھی ایک کمرے میں جا پہنچتی تو کبھی دوسرے کمرے میں۔ ایک کمرے کے دروازے پر اُس نے قفل لگا ہوا دیکھا۔ اُس کے دل میں یہ کمرہ اندر سے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ چابی تالے میں ہی لٹک رہی تھی۔ ہلکی سی آواز سے قفل کھل گیا۔ اُس نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک بڑھیا کو چرخا کاتتے ہوئے پایا۔ شہزادی اُس بڑھیا کے قریب پہنچ کر بولی:

"دادی اماں! سلام"

"جیتی رہو بیٹی! کہو کیسے آنا ہوا؟" بڑھیا نے پوچھا

"یونہی اِدھر آ نکلی"...... شہزادی نے جواب دیا۔

"مگر آپ کیا بنا رہی ہیں؟"

"سوت کات رہی ہوں بیٹی"...... بڑھیا نے جواب دیا۔

"دادی اماں! میں بھی تھوڑا سا سوت کات کر دیکھوں"

بڑھیا نے پہلے تو شہزادی کو منع کیا مگر اُس کی ضد کے آگے اُس کی ایک نہ چلی۔ شہزادی نے ابھی چرخہ چلانا شروع ہی کیا تھا کہ وہ "اوئی ماں" کہہ کر چیخ پڑی۔ اُس کی انگلی چرخے کے پہیئے میں پھنس کر کٹ گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شہزادی کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ بستر پر جا کر لیٹ گئی۔ لیکن یہ نیند چھوت کی بیماری کی طرح سارے محل میں پھیل گئی۔ درباری' نوکر' خادمائیں سبھی تو سو گئے' راجہ اور رانی مندر سے لوٹ کر آئے تو محل میں قدم رکھتے ہی اُن کی آنکھیں بھی نیند سے بند ہونے لگیں اور اپنے کمرے تک پہنچتے پہنچتے وہ بھی گہری نیند سو گئے۔ اصطبل میں بندھے ہوئے گھوڑے' صحن میں کھڑے کتے' چھت پر بیٹھے کبوتر اور دیواروں پر بھنبھناتی ہوئی مکھیوں پر بھی نیند طاری ہو گئی اور وہ سب بھی سو گئے۔ چولہے میں سلگتی ہوئی آگ بھی ماند پڑ گئی جیسے اُس

پر بھی نیند کا اثر پڑ گیا ہو۔ ہوا بند ہوگئی اور درختوں کے پتے بھی ہل نہیں رہے تھے۔

جب شاہی محل میں رہنے والے سب لوگ ہی خاموش ہوگئے اور وہاں ہر طرف گہرا سناٹا چھا گیا تو محل کے ہر طرف کانٹے دار جھاڑیاں اور پھولوں کی جھاڑیاں اُگنے لگیں اور چند ہی سالوں میں یہ جھاڑیاں اتنی اُونچی ہوگئیں کہ اُنہوں نے سارے محل کو ہی ڈھانپ لیا یہاں تک کہ محل کی چھت پر راجہ کا لہراتا ہوا جھنڈا بھی جھاڑیوں میں چھپ گیا اور محل کے رہنے والے تھے کہ اب تک پڑے بے خبر سوتے تھے۔

یوں تو شہزادی کی کہانی دُور دُور ملکوں تک پھیل گئی تھی اور لوگ اُسے نیند کی شہزادی اور بعض پھولوں کی شہزادی کہہ کر پکارنے لگے تھے۔ اُس کی خوبصورتی کے چرچے بھی ہر سو عام تھے۔ بہت سے شہزادوں نے محل کے چاروں طرف پھیلی ہوئی اُونچی جھاڑیوں کو پار کر کے شہزادی تک پہنچنے کی کوشش کی مگر جب کوئی اِن جھاڑیوں میں داخل ہوتا تو وہ اُسے اپنے میں یوں لپیٹ لیتیں جیسے وہ جھاڑیوں کی بجائے کسی مضبوط ہاتھوں میں چلا گیا ہو وہ وہیں پھنس کر رہ جاتا اور آخر تڑپ تڑپ کر اپنی جان گنوا بیٹھتا۔

اسی طرح کئی سال گزر گئے لیکن کوئی بھی شہزادی کے پاس پہنچنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ ایک دفعہ ایک دُور ملک کا بہادر شہزادہ گھومتا پھرتا ہوا وہاں آنکلا۔ اُس نے شہزادی کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اُسے وہ جھاڑیوں اور سب سے زیادہ شہزادی کو دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ لوگوں نے اُسے بہت ڈرایا لیکن اُس نڈر شہزادے نے ہمت نہ ہاری اور بولا:

"مجھے کسی چیز کا ڈر نہیں۔ میں اپنی تلوار سے جھاڑیوں کو کاٹتا ہوا پھولوں کی شہزادی کے پاس جاؤں گا"

بہادر شہزادے نے کسی کی ایک نہ سنی اور وہ تلوار سے جھاڑیوں کو کاٹتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ قسمت بھی ہمیشہ بہادروں کا ساتھ دیتی ہے۔ اُدھر شہزادی کی نیند کے سو سال پورے ہوگئے۔ اِس لئے جیسے جیسے شہزادہ آگے بڑھتا جا رہا تھا' جھاڑیاں اُس کا راستہ چھوڑ رہی تھیں۔ شہزادہ بہادری سے تلوار کی مدد سے راستہ صاف کرتا چلا جا رہا تھا۔ آخر کار وہ محل کے دروازے کو کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ وہ ایک ایک کمرے میں جاتا' ہر جگہ اُس نے لوگوں کو سوئے ہوئے پایا۔ راجہ' رانی' درباری' نوکر چاکر سبھی سوئے ہوئے تھے۔ وہ ایک ایک کو دیکھتا ہوا آخر شہزادی کے کمرے میں پہنچا۔ شہزادی کو سوئے دیکھ کر وہ

اُس کی خوبصورتی سے بہت متاثر ہوا اور حیران رہ گیا۔ اُس کی آہٹ پا کر شہزادی آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھ بیٹھی اور بولی:

"آپ کون ہیں؟ کیا دن نکل آیا؟"

"دن"...... شہزادہ ہنسا اور پھر بولا:

"میں نے سنا ہے کہ آپ سو سال سے سو رہی ہیں"

"نہیں تو" شہزادی نے حیرانی سے کہا۔

"آپ ذرا اپنے محل کے باہر تو نظر ڈالیں، جنگل بنا ہوا ہے"

"واقعی"

شہزادی نے جب سامنے کی کھڑکی سے باہر دیکھا تو جنگل نظر آیا۔ وہ بولی:

"لیکن آپ؟"

"میں فلاں ملک کا شہزادہ ہوں"...... شہزادہ بول اُٹھا۔

اتنے میں راجہ رانی، درباری، وزراء، نوکر چاکر اور خادمائیں سبھی اُٹھ بیٹھے۔ لیکن جب اُنہوں نے شاہی محل کے گرد درختوں کا جنگل دیکھا تو حیران ہوئے۔ شہزادے نے بتایا کہ وہ سب سو سال تک سوتے رہے ہیں۔ راجہ کو تیرھویں فقیرنی کی بددُعا یاد آ گئی۔ وہ بولا:

"خدا کا شکر ہے کہ مصیبت ہمارے سر سے ٹل گئی ہے"

چند ہی روز میں شاہی محل کے گرد موجود جنگل کو کاٹ کر خوبصورت باغیچہ بنا دیا گیا۔ لوگ جوق در جوق راجہ رانی، شہزادی اور شہزادے کو دیکھنے شاہی محل چلے آ رہے تھے۔ شاہی دربار سجا ہوا تھا لیکن سب سے زیادہ خوشی شہزادے کو تھی کیونکہ آج اُس کی شادی پھولوں کی شہزادی سے ہونے والی تھی۔

رات کو شادی کی خوشی میں ملک بھر میں گھر گھر چراغ جلائے گئے۔ خوب رنگ برنگی آتش بازی چھوڑی گئی۔ غریبوں کی دل کھول کر امداد کی گئی، یتیم اور بے سہارا لوگوں کو کھانا کھلایا گیا۔ شاہی محل کو اِس قدر خوبصورتی سے سجایا گیا تھا کہ دُور سے دیکھنے پر وہ "روشنی کا محل" معلوم ہوتا تھا۔

شادی کے بعد راجہ نے شاہی تخت و تاج شہزادے کے سپرد کر دیا اور خود یادِ الٰہی میں مشغول ہو گیا۔ شہزادے کے والدین کو جب اِس شادی کی خبر ملی تو وہ چاند سی بہو کو دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سمائے اور اُسے قیمتی تحائف کے علاوہ بے شمار دُعائیں بھی دیں۔ اِس طرح شہزادہ اپنی بہادری سے دونوں ملکوں پر حکومت کرنے لگا۔

ہنسی کی برسات

ایک پروفیسر گول دروازے کے گرد گھوم رہے تھے۔ آخر کار ایک شناسا نے پوچھا:
"پروفیسر منیر صاحب! یہ آپ دروازے کے گرد چکر کیوں لگا رہے ہیں؟"
"دراصل مجھے یاد نہیں آرہا ہے کہ میں اندر جا رہا ہوں یا باہر"...... پروفیسر نے جواب دیا۔

☆☆☆☆☆

ایک غائب دماغ پروفیسر صاحب کسی جنازے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور اپنی ہی سوچوں میں گم تھے۔ راستے میں ایک اور شخص جنازے میں شامل ہوا۔ وہ پروفیسر سے پوچھنے لگا:
"یہ کس کا جنازہ ہے؟"
پروفیسر نے چونک کر جواب دیا:
"پتہ نہیں، میرا خیال ہے جسے کندھوں پر اُٹھائے لوگ لے جا رہے ہیں اُسی کا ہوگا"......

مرسلہ: [illegible] جعفری، لاہور

ایک دوست: (دوسرے دوست سے): "جب میں بات کرتا ہوں تو چیختے گدھے خاموش ہو جاتے ہیں"
دوسرا دوست: "وہ سوچتے ہوں گے کہ چلو اپنے کسی اور بھائی کو بھی بولنے کا موقع دیں"

☆☆☆☆☆

انور: "اگر تم میرے سوال کا جواب دو تو میں تمہیں مان جاؤں"
ندیم: "سوال کیا ہے؟"
انور: "ہاتھی اور زیبرے میں کیا فرق ہے؟"
ندیم: "کوئی بھی نہیں"
انور: "وہ کیسے؟"
ندیم: "دونوں اسکوٹر نہیں چلا سکتے"......

☆☆☆☆☆

پہلا دوست: "تم نے دیکھا کہ بدتمیز کنڈیکٹر مجھے یوں گھور رہا ہے جیسے میں نے ٹکٹ ہی نہ لیا ہو"
دوسرا: "ہاں اور تم نے دیکھا کہ میں کنڈیکٹر کی طرف اس طرح دیکھ رہا ہوں جیسے میں نے ٹکٹ لے لیا ہو۔